منشی پریم چند (مرحوم)



بک لینڈ۔ بھیروں بازار
جالندھر شہر

قیمت : ۳ روپے

٥

ڈیر ملاپ پریس ملاپ لوہے جالندھر میں منشی چھجو رام مالک بک لینڈ
بھیروں بازار جالندھر کے لئے چھپا۔

پنچایت

(۱)

جمن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں بھی کچھ ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد تھا۔ جمن جب حج کرنے کو گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے۔ اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ وہ نہ ہم نوالہ تھے نہ ہم پیالہ۔ نہ ہم مشرب۔ صرف ہم خیال تھے اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا۔ جب دونوں لڑکے جمن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبرو زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ الگو نے اُستاد کی بہت خدمت کی۔ خوب رکابیاں مانجیں۔ خوب پیالے دھوئے۔ اُن کا حقّہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا، جسے الگو خوب جانتے تھے۔ اُن کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلہ میں اُنہیں اُستاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ

تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ اُستاد کی دُعا چاہیئے۔ جو کچھ ہوتا ہے فیض سے ہوتا ہے۔ اور اگر الگو پر اُستاد کے فیض یا دُعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا تو اُسے تسکین تھی، کہ تحصیل علم کا کوئی دقیقہ اُس نے فرد گزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقادیر میں ہی نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود دُعا اور فیض کے مقابلہ میں تازیانہ کے زیادہ قائل تھے۔ اور جمّن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمّن کی قرب و جوار کے مواضعات میں پرستش ہوتی تھی۔ اُن کے بیعنامہ یا رہن نامہ کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین، کانسٹیبل اور تحصیل کا مذکوری یہ سب ان کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ اس لئے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا تو شیخ جمّن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جمّن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ اُن کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی۔ مگر قریبی وارث کوئی نہ تھا۔ جمّن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرالی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہ ہوئی تھی خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے۔ مگر رجسٹری کی مُہر ہوتے ہی اُن خاطر داریوں پر بھی مُہر ہوگئی۔ وہ وعدے وصال کے وعدے ثابت ہوئے۔ جمّن کی اہلیہ بی فہیمن نے روٹیوں کے ساتھ کچھ تیز تیکھی باتوں کے سالن دینے بھی شروع

کئے اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے بڑھنے لگی۔ "بڑھیا عاقبت کے بورئیے بٹورے گی کیا؟ دو، تین بیگھے اوسر کیا دے دیا ہے گویا مول لے لیا ہے بگھاری دال بغیر روٹیاں نہیں اترتیں۔ جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں جھونک چکے اس سے تو ابتک کئی گاؤں مول لے لیتے۔ کچھ دنوں تک خالہ جان نے سنا اور ضبط کیا مگر جب برداشت نہ ہوئی تو جمن سے شکایت کی۔ جمن صلح پسند آدمی تھے "مقامی" کارکن کے انتظام میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا کچھ دن اور یونہی رو دھو کر کام چلا۔ آخر ایک روز خالہ جان نے جمن سے کہا" بیٹا! تمہارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو۔ میں اپنا الگ پکالوں گی"۔

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا" روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے؟"

خالہ جان نے بگڑ کر کہا۔ " تو مجھے کچھ نان نمک چاہیئے یا نہیں؟"

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا" چاہیئے کیوں نہیں میرا خون چوس لو۔ کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لیکر آئی ہو؟"

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامہ سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن ہنسے۔ وہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پہ ہرن کو جال کیطرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا!" ہاں ضرور پنچایت کرو۔ فیصلہ ہو جائے۔ مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں"۔

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی۔ اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب وجوار میں ایسا کون تھا، جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو؟ کون

تھا۔ جوان کی دشمنی کو حقیر سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ آسمان کے فرشتے تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں۔ مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

(۳)

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لئے آس پاس گے گاؤں کے چکر لگاتی رہی۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا مگر بات آپڑی تھی۔ اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت۔ رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ زاری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر خوبیٔ تقدیر کوئی اس طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا۔ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ "ذرا اس ہوس کو دیکھو! قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن ہوا۔ مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمہیں گھر بار۔ جگہ زمین سے کیا سروکار۔ ایک لقمہ کھاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو اور مالک کی یاد کرو۔" سب سے بڑی تعداد ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر، پوپلا منہ۔ سن کے سے سفید بال اور ثقل سماعت، جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی کا آنا ایک قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے دردرس۔ انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جنہوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو اور اس کی تشفی کی ہو۔ چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔

لاٹھی ٹیک دی اور دم لے کر کہا: "بیٹا! تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا۔"
الگو بے رُخی سے بولے: "مجھے بلا کے کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں ہی گے۔"

خالہ نے ہانپ کر کہا: "اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں۔ آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے؟ ہمارے سیّد سالار لگانے گھا رسن کر پیڑھی سے اُٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا؟

الگو نے جواب دیا: "یوں آنے کو میں آجاؤں گا مگر پنچایت میں مُنہ نہ کھولوں گا۔"

خالہ نے حیرت سے پوچھا: "کیوں بیٹا؟"
الگو نے پیچھا چھڑانے کیلئے کہا: "اب اس کا کیا جواب! اپنی اپنی طبیعت۔ جمّن میرے پُرانے دوست ہیں۔ اُن سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔"
خالہ نے تاک کر نشانہ مارا: "بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟"

ہمارے سوئے ہوئے ایمان کی ساری جتھا چوری سے لُٹ جائے۔ اُسے خبر نہیں ہوتی مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے۔ اور ہشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ "نہیں" کہنے کی جُرأت کر سکتے تھے؟

(۲)

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حقہ پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی۔ وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا، ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ باأثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے، جنہیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پروا نہیں ہو سکتی تھی۔ کتے مجلس کو دعوتِ احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی بی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ "پنچو! آج تین سال ہوئے میں نے اپنی سب جائیداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھ دی تھی۔ اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے تا حینِ حیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بیکس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم لوگ جو راہ نکال دو، اس راہ پر چلوں۔ اگر میری برائی دیکھو میرے منہ پر تھپیڑ مار دو۔ جمن کی برائی دیکھو، تو اسے سمجھاؤ کیوں ایک بیکس کی آہ لیتا ہے۔"

رام دھن مصر بولے۔ "(ان کے کئی آسامیوں کو جمن نے توڑ لیا تھا) جمن میاں تم پنچ کسے بدتے ہو۔ ابھی سے طے کر لو۔"

جمن نے حاضرین پر ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے تیئں مخالفوں کے نرغے میں پایا۔ دلیرانہ انداز سے کہا "خالہ جان جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے عذر نہیں ہے۔"

خالہ نے چلّا کر کہا "ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا۔"

جمن نے بڑھیا کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ۔ جسے چاہو پنچ بنا دو۔"

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں "بیٹا خدا سے ڈر میرے لئے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہی دشمن ہیں؟ اچھا۔ اور سب کو جانے دو۔ الگو چودھری کو تو مانے گا؟"

جمن فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے مگر ضبط کر کے بولے "الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لئے جیسے رام دھن مصر ویسے الگو۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔"

الگو بغلیں جھانکنے لگے۔ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز سے کہا "بوڑھی اماں! تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے؟"

خالہ نے جواب دیا "بیٹا دوستی کیلئے کوئی اپنا ایمان نہیں بیچتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کی طرف سے

نکلتی ہے۔"

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا سر پیٹنے۔ رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے۔

الگو چودھری نے فرمایا۔ "شیخ جمن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں جب ضرورت پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے۔ تمہاری خدمت کرتے آئے ہیں مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو نہ ہم تمہارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا۔ تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو۔ کہو۔"

جمن ایک شان فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کی بجائے سمجھتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا ان بن رہتی ہے۔ اسمیں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے۔ وہ کسی سے چھپی نہیں آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔"

الگو چودھری کو آئے دن عدالت سے واسطہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمن سے جرح کرنے لگے۔ ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے۔ جمن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی! اس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے۔ وہ

یہ تو جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے پر اُٹھتے ہیں اور کیا لگا سی ہوتی ہے۔
ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔
جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت متین اور
حکیمانہ تھا۔
"شیخ جمن! پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر
تمہاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ خالہ جان کے
ماہوار گزارے کا بندوبست کردو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں اگر تمہیں
یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔"
جمن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آگیا۔ احباب سے کہنے لگے "بھئی
اس زمانے میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے اُس کی گردن پر چھری پھیری
جائے۔ اسی کو نیرنگئ روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغاباز جو فروش گندم نما نہ ہوتے
تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انہی مکاریوں کی سزا ہے۔"
مگر رام دھن مصرا اور فتح خاں اور جگو سنگھ اس بے لاگ فیصلہ کی تعریف
میں رطب اللسان تھے۔ "اس کا نام پنچائیت ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔
دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے۔ ایسے ہی ستیہ بادیوں سے
دنیا قائم ہے ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔"
اس فیصلے نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت
حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے مگر تیر و سپر کی طرح۔ جمن کے

دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا۔ اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

(۵)

خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا۔ پچھلے سال بھر بٹیسر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب وجوار کے لوگ انہیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچائیت کے ایک مہینہ بعد ایک بیل مر گیا۔ جمن نے اپنے دوستوں سے کہا۔ یہ دغابازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔ الگو کو اندیشہ ہوا۔ کہ جمن نے اسے زہر دلوا دیا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائین کا خیال تھا کہ اس پر کچھ کرا دیا گیا ہے۔ چودھرائین اور فہمین میں ایک دن زور شور سے ٹھنی۔ دونوں خاتونوں نے روانی بیان کی، ندی بہادی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمن نے آگ بجھائی۔ بیوی کو ڈانٹا اور رزم گاہ سے ہٹا لے گئے۔ ادھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائین کی شیریں کلامیوں کی داد دی۔

اب ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھے۔ وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ۔ گھی بھرتے اور منڈی لیجاتے۔ منڈی سے تیل۔ نمک لادکر لاتے۔ گاؤں میں بیچتے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچے اسے لے لوں تو دن میں

بلا کسی منت کے تین کھیوے ہوں۔ نہیں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا، گاڑی میں دوڑایا۔ بال بھونری کی پہچان کرائی۔ مول بھاؤ کیا اور اپنے دڑانے پر لاکر باندھ دیا۔ دام کیلئے ایک مہینہ کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے، گھاٹے کی کچھ پروا نہ کی۔

جھینگر نے نیا بیل پایا۔ تو پاؤں پھیلائے۔ دن میں تین تین، چار چار کھیوے کرتے۔ نہ چارے کی فکر تھی نہ پانی کی۔ بس کھیووں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے وہاں کچھ سوکھا بھس ڈال دیا۔ اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے، تو چین کی بنسی بجتی تھی۔ راتب پاتے، صاف پانی، دلی ہوئی ارہر، بھوسہ کیسا تھ کھلی، کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی چکھ جاتا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرے کرتا۔ بدن کھجلاتا۔ جھاڑتا۔ پونچھتا۔ سہلاتا۔ کہاں وہ نازو نعمت۔ کہاں یہ آٹھوں پہر کی رٹ۔ مہینہ بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بیچارے کا ہیاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ لیکن اصیل جانور، مار کی تاب نہ تھی، ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور۔ پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر۔ کئی کوڑے بیدردی سے لگائے۔ بیل نے ایکبار پھر زور لگایا مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ سیٹھ نے بہت پیٹا۔ ٹانگ پکڑ کر کھینچی۔ نتھنوں میں لکڑی کھونس

دی۔ مگر لاش نہ اُٹھی۔ تب کچھ اندیشہ ہوا۔ غور سے دیکھا۔ بیل کو کھول کر الگ کیا۔ اور
سوچنے لگے کہ گاڑی گھر کیونکر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلّائے مگر دیہات کا راستہ
بچّوں کی آنکھ ہے۔ سرِ شام سے بند۔ کوئی نہ نظر آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔
مارے غصّہ کے مُوئے بیل پر اور دُرّے لگائے۔ سسُرے! تجھے مرنا تھا۔
تو گھر پر مرتا۔ تُو نے آدھے رستے میں دانت نکال دیئے اب گاڑی کون کھینچے؟
اس طرح خوب جلے بھُنے۔ کئی بورے گُڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو ڈھائی
سَو روپیے کمر میں بندھے ہُوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے۔ چھوڑ کر
جا بھی نہ سکتے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے۔ وہیں رتجگا کرنے کی ٹھان لی۔ اور
آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے۔ حقّہ پیا۔ گایا۔ پھر حقّہ پیا۔ آگ جلائی
تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے ہی رہے۔ مگر جب پو پھٹی۔ چونکے اور کمر پر
ہاتھ رکھا۔ تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سَن سے ہو گیا۔ کمر ٹٹولی۔ تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا
کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا۔ پچھاڑیں کھانے
لگے۔ صبح کو بہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثۂ الم ناک سُنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب
روئیں۔ تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظ ماتقدم کی سوجھی۔ نگوڑے
نے ایسا منحوس بیل دیا۔ کہ سارے جنم کی کمائی لُٹ گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگتے تھے
تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلّائے ہوئے کُتّوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ یہاں تو

سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ ڈھیر ہو گئے۔ انہیں دام کی پڑی ہے۔ مُردہ منحوس بیل دیا تھا۔ اس پہ دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونک دی۔ مرا ہُوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا چونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ۔ تب دام لینا۔ صبر نہ ہوتا ہو۔ تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو۔ اور کیا لوگے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدردان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سُن کر چوہدری لوٹ آئے۔ مگر ڈیڑھ سو روپیہ اس طرح ہاتھ دھولینا آسان کام نہ تھا۔ ایک بار وہ بھی بگڑے۔ سیٹھ جی گرم ہو پڑے۔ سیٹھانی جی خدا بہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مُباحثہ ہوا۔ مجادلہ کی نوبت پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کر لیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا۔ اور صلاح دی۔ کہ اس طرح آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلیگا۔ اس سے کیا فائدہ۔ پنچایت کر لو۔ جو کچھ طے ہو جائے۔ اُسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے۔ الگو نے بھی حامی بھری۔ فیصلہ ہو گیا۔

(۶)

پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اُسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت۔ کھیتوں میں کوؤں پنچایت ہوئی تھی۔ امر متنازعہ یہ تھا۔ مٹر کی پھلیوں پر ان کا جائز استحقاق ہے۔ یا نہیں۔ اور جب تک یہ مسئلہ

طے نہ ہو جائے وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے داد پر اپنی بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں زبردست مباحثہ ہو رہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انہیں من حیث القوم بیوفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

پنچایت پوری آ بیٹھی تو رام دھن مصر نے کہا "اب کیوں دیر کی جائے بدلو۔ چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟"

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا۔ "سمجھو سیٹھ ہی چن لیں۔"

سمجھو سیٹھ کھڑے ہو گئے۔ اور کڑک کر بولے "میری طرف سے شیخ جمن کا نام لکھ لو۔"

الگو نے پہلا نام جمن کا سنا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ گویا کسی نے اچانک تھپیڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہ پر پہنچ گئے۔ بولے "چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟"

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

اس کے بعد چار نام اور تجویز کئے گئے۔ الگو پہلا چرکا کھا کر ہشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلہ کو کیونکر طے کریں کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوردھن شاہ بولے۔

"سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟"
سمجھو کھڑے ہو گئے۔ اور اکڑ کے بولے "شیخ جمّن کو"۔
رام دھن مصر نے چوہدری طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا "الگو تمہیں کچھ عذر ہو تو کہو"۔
الگو نے قسمت ٹھونک لی۔ حسرت ناک لہجے میں بولے۔ "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

(۷)

اپنی ذمّہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے۔ اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما۔
ایک اخبار نویس اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلسِ وُزرا کو کتنی بیباکی اور آزادی سے اپنے تازیانۂ قلم کا نشانہ بناتا ہے۔ مگر ایسے مواقع بھی آتے ہیں۔ جب وہ خود مجلسِ وزرا میں شریک ہوتا ہے۔ اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی اُس کی تحریر میں ایک دلپذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ذمّہ داری کا احساس ہے۔
ایک نوجوان عالم شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے۔ والدین اُسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اُسے ننگِ خاندان سمجھتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہی وارفتہ مزاج، ننگِ خاندان کتنا سلامت رو، کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ ذمّہ داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کر دیتا ہے۔ مگر زبان کو محدود۔
شیخ جمّن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمّہ داری کا احساس ہوا۔ اُس نے

سوچا۔ میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکمِ خدا ہے۔ اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیئے۔ حق اور راستی سے جو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں رُو سیاہ بنا دیگا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ فریقین نے اپنے حالات بیان کیے۔ جرح ہوئی شہادتیں گذریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی۔ جمن نے بہت غور سے سنا۔ اور تب فیصلہ سنایا۔

"الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ! پنچوں نے تمہارے معاملہ پر غور کیا سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل اُن کے گھر آیا۔ اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اُسی وقت دیدی گئی ہوتی۔ تو آج سمجھو اُسے واپس لینے کا ہر گز تقاضا نہ کرتے"۔

رام دھن مصر نے کہا۔ "قیمت کے علاوہ اُن سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کے مار ڈالا"۔

جمن نے کہا۔ "اس کا اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے"

گودڑ شاہ نے کہا۔ "سمجھو کے ساتھ کچھ رعائیت ہونی چاہیئے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے۔ اور اپنے کیئے کی سزا مل چکی ہے۔

جمن بولے۔ "اس کا بھی اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے"۔ یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری پھولے نہ سمائے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور زور زور سے ہانک لگائی۔ "پنچ پرمیشور کی جے"۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ اس نعرہ کیساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔
ہر شخص جمن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ انصاف اس کو کہتے ہیں! آدمی کا یہ کام نہیں۔ پنچ میں پرماتما بستے ہیں۔ یہ ان کی مایا ہے۔ پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا اپنا نا مشکل ہے۔
ایک گھنٹہ کے بعد جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے۔ اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے "بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے۔ میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا یہ بھی خدا کی شان ہے۔ آج مجھے یقین آگیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔
الگو رونے لگے۔ دل صاف ہو گئے۔ دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا ہو گیا اب وہ بالو کی زمین پہ نہیں۔ حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

٭ ٭ ٭

بانکا زمیندار

(۱)

ٹھاکر ریودمن سنگھ ایک ممتاز وکیل تھے اور اپنے حوصلہ و ہمّت کیلئے سارے شہر میں مشہور۔ اُن کے اکثر احباب کہا کرتے کہ اجلاسِ عدالت میں ان کے مردانہ کمالات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اسی کی برکت تھی کہ باوجود اس کے کہ اُنہیں شاذ ہی کسی معاملہ میں سُرخروئی حاصل ہوتی تھی۔ ان کے موکلوں کے حُسنِ عقیدت میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ صدرِ انصاف پر جلوہ فرما ہونے والے بزرگوں کی بے خوف آزادی پر کسی قسم کا شُبہ کرنا کفر ہی کیوں نہ ہو۔ مگر شہر کے واقفکار لوگ علانیہ کہتے تھے کہ ٹھاکر صاحب جب کسی معاملے میں ضد پکڑ لیتے ہیں، تو ان کا بدلا ہوا تیور اور تمتمایا ہوا چہرہ انصاف کو بھی اپنا تابعِ فرمان بنا لیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر اُن کے جیوٹ اور جگر نے وہ معجزے کر دکھائے تھے۔ جہاں انصاف اور قانون نے جواب دیدیا

دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر صاحب مردانہ اوصاف کے سچے جوہر شناس تھے، اگر مؤکل کو فنِ زور آزمائی میں کچھ دسترس ہو، تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ انکی عنایات حاصل کرنے کیلئے مال و زر کا منت کش بنے۔ اسی لئے ان کے یہاں شہر کے پہلوانوں اور پھکیتوں کا ہمیشہ جھگمٹ رہتا تھا، اور یہی وہ زبردست، پُرتاثیر اور غیر عملی نکتہ قانون تھا جس کی تردید کرنے میں انصاف کو بھی تامل ہوتا تھا، وہ غرور اور سچے غرور کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کے خانہ بے تکلف کے آستانے بہت اونچے تھے۔ وہاں جھکنے کی ضرورت نہ تھی، انسان خوب سر اٹھا کر جا سکتا تھا۔ یہ معتبر روایت ہے کہ ایکبار انہوں نے کسی مقدمہ کو باوجود بہت منت و اصرار کے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا، مؤکل کوئی اکھڑ دہقان تھا۔ اس نے جب منت سے کام نکلتے نہ دیکھا تو ہمت سے کام لیا۔ وکیل صاحب کرسی سے نیچے گر پڑے اور بپھرے ہوئے دہقان کو سینے سے لگا لیا۔

(۲)

دولت کو زمین سے ازلی مناسبت ہے۔ زمین میں عام کشش کے سوا ایک خاص طاقت ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ دولت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سود اور تمسک اور تجارت یہ دولت کی درمیانی منزلیں ہیں۔ زمین اس کی منزل مقصود ہے۔ ٹھاکر ریودمن سنگھ کی نگاہیں بہت عرصے سے ایک بہت زرخیز موضع پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن بنک کا اکاؤنٹ کبھی حوصلہ کو قدم نہیں بڑھانے دیتا تھا، یہانتک کہ ایک دفعہ اسی موضع کا زمیندار ایک قتل کے معاملہ میں ماخوذ ہوا۔ اُس نے

صرف رسم و رواج کے موافق ایک اسامی کو دن بھر دھوپ اور جیٹھ کی جلتی ہوئی
دھوپ میں کھڑا رکھتا تھا۔ لیکن اگر آفتاب کی تمازت یا جسمانی کمزوری یا پیاس
کی شدت اس کی جان لیوا بن جائے تو اسمیں زمیندار کی کیا خطا تھی؟ یہ وکلاء
شہر کی زیادتی تھی۔ کہ کوئی اس کی حمایت پر آمادہ نہ ہوا۔ یا ممکن ہے زمیندار کی تہی
دستی کو بھی اس میں کچھ دخل ہو۔ بہر حال اس نے چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر
ٹھاکر صاحب کی پناہ لی۔ مقدمہ نہائیت کمزور تھا۔ پولیس نے اپنی پوری طاقت
سے دھاوا کیا تھا۔ اور اس کی کمک کیلئے حکومت اور اختیار کے تازہ دم رسالے
تیار تھے۔ ٹھاکر صاحب آزمودہ کار سپیروں کیطرح سانپ کے ماند میں ہاتھ نہیں ڈالتے
تھے۔ لیکن اس موقع پر انہیں خشک مصلحت کے معاملہ میں اپنی خواہشات کا
پلہ جھکتا ہوا نظر آیا۔ زمیندار کی تشفی کی اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ اور پھر ایسی
جانفشانی سے مقدمہ کی پیروی کی۔ کچھ اسطرح جان لڑائی کہ میدان سے
فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے نکلے۔ زبان خلق اس فتح کا سہرا انکی
قانونی دسترس کے سر نہیں۔ ان کے مردانہ اوصاف کے سر رکھتی ہے۔ کہ ان دنوں
وکیل صاحب نظائر و دفعات کی ہمت شکن پیچیدگیوں میں الجھنے کی بجائے
زندگی کی حوصلہ بخش دلچسپیوں میں زیادہ منہمک رہتے تھے۔ لیکن یہ مطلق
قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ واقفکار لوگ کہتے ہیں۔ کہ انار کے بم گولوں،
اور سیب و انگور کی گولیوں نے پولیس کے اس حملہ کو منتشر کر دیا۔ الغرض
میدان ہمارے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ رہا۔ زمیندار کی جان بچی۔ موت کے منہ سے نکل آیا۔
ان کے پیروں پر گر پڑا اور بولا۔" ٹھاکر صاحب میں اس قابل تو نہیں کہ آپکی خدمت کر

سکوں (ایشور نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن کرشن بھگوان نے غریب سداماں کے
سوکھے چاول خوشی سے قبول کئے تھے۔ میرے پاس بزرگوں کی یادگار ایک چھوٹا سا
ویران موضع ہے۔ اُسے آپکی نذر کرتا ہوں۔ آپ کے لائق تو نہیں۔ لیکن میری خاطر
سے اسے قبول کیجئے۔ میں آپ کا جس کبھی نہ بھولوں گا۔" وکیل صاحب پھڑک اُٹھے۔
دوچار بار عارفانہ انکار کے بعد اس نذر کو قبول کر لیا۔ مُنہ مانگی مُراد بر آئی۔

(۲)

اس موضع کے لوگ نہایت سرکش اور فتنہ پرداز تھے۔ جنہیں اس بات کا فخر
تھا کہ کبھی کوئی زمیندار انہیں پابند عناں نہیں کر سکا۔ لیکن جب اُنہوں نے اپنی
باگ ڈور رائے دمن سنگھ کے ہاتھوں میں جاتے دیکھی تو چوکڑیاں بھول گئے۔ ایک بدلگام
گھوڑے کی طرح سوار کو کنکھیوں سے دیکھا، کنوتیاں کھڑی کیں، کچھ ہنہنائے اور
تب گردنیں جھکا دیں۔ سمجھ گئے کہ یہ جگر کا مضبوط اور آسن کا پکا شہسوار ہے۔

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں در بدر
پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دلہن بنی ہوئی تھی۔ اور فاقہ کش کمہار بارات
کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں اُن کی نگاہ
کرم کی منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت اُن کے دست شفقت کے محتاج۔
جسے چاہتے بسا تے تھے۔ جسے چاہتے اجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے
لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے
ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور
جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پرمزہ شغل تھا۔ نالے پرشور، ندیاں اتھاہ، چاروں اف ہریالی

وہ سبزہ اور زہت کا حسن بسیط۔ انہیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کیطرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی برات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ! گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کر و فر دیکھا تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے۔ اور گنڈے گلیوں میں۔ شام کیوقت ٹھاکر صاحب نے اپنے اسامیوں کو بلایا۔ اور تب بہ آواز بلند بولے "میں نے سنا ہے تم لوگ بڑے سرکش ہو۔ اور میری سرکشی کا حال تم کو معلوم ہی ہے۔ اب اینٹ اور پتھر کا سامنا ہے۔ بولو کیا منظور ہے؟"

ایک بوڑھے کسان نے بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے جواب دیا "سرکار آپ ہمارے راجہ ہیں۔ ہم آپ سے اینٹھ کر کہاں جائیں گے؟"

ٹھاکر صاحب تیور بدل کر بولے "تم لوگ سب کے سب کل صبح تک تین سال کا پیشگی لگان داخل کر دو اور خوب دھیان دے کر سن لو۔ کہ میں حکم کو دہرانا نہیں جانتا ورنہ میں گاؤں میں ہل چلوا دوں گا۔ اور گھروں کو کھیت بنا دوں گا۔"

سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تین سال کا پیشگی لگان اور اتنی جلدی فراہم ہونا غیر ممکن تھا۔ رات اسی حیص بیص میں کٹی۔ ابھی تک منت و سماجت کی برقی تاثیر کی امید باقی تھی۔ صبح بہت انتظار کے بعد آئی۔ تو قیامت بنکر آئی۔ ایک طرف تو جبر و تشدد اور ظلم و تحکم کے ہنگامے گرم تھے۔ دوسری طرف دیدۂ گریاں اور آہ سرد اور نالۂ بیداد کے۔ غریب کسان اپنے اپنے نقچے لادے بیکسانہ انداز سے تاکتے۔ آنکھوں میں التجا۔ بیوی بچوں کو ساتھ لئے روتے بلکتے۔ کسی نامعلوم دیار غربت کو چلے جاتے تھے۔ شام ہوئی۔ تو گاؤں شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔

(۴)

یہ خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے انسان ہونے پر شکوک ہونے لگے۔ گاؤں ویران پڑا ہوا تھا۔ کون اسے آباد کرے؟ کس کے بچے اُس کی گلیوں میں کھیلیں؟ کس کی عورتیں کنوؤں پر پانی بھریں! راہ چلتے ہوئے مسافر تباہی کا یہ نظارہ آنکھوں سے دیکھتے اور افسوس کرتے۔ نہیں معلوم بیچارے غریب زدوں پر کیا گزری۔ آہ! جو محنت کی کمائی کھاتے اور سر اٹھا کر چلتے تھے۔ اب دوسروں کی غلامی کر رہے ہیں۔

اس طرح ایک پورا سال گزر گیا۔ تب گاؤں کے نصیب جاگے۔ زمین زرخیز تھی۔ مکانات موجود۔ رفتہ رفتہ ظلم کی یہ داستان پھیکی پڑ گئی۔ منچلے کسانوں کی ہوسناک نگاہیں اس پر پڑنے لگیں۔ بلا سے زمیندار ظالم ہے۔ جابر ہے۔ بے رحم ہے۔ ہم اُسے منا لیں گے۔ تین سال کی پیشگی لگان کا کیا ذکر۔ وہ جیسے خوش ہوگا۔ خوش کریں گے! اُس کی گالیوں کو دُعا سمجھیں گے۔ اس کے جوتے اپنے سر آنکھوں پہ رکھیں گے۔ وہ راجہ ہیں۔ ہم اُن کے چاکر ہیں! زندگی کی کشمکش اور جنگ میں خودداری اور عزت کو نباہنا کیسا مشکل کام ہے! دوسرا اساڑھ آیا۔ تو وہ گاؤں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے، مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیتے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گزرا۔ جب ربیع کی دوسری فصل آئی، تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے

سونا اگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں، کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور دار وغہ جی کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آئند خبریں سنی اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام وہی لٹھیتوں کا رسالہ۔ وہی گنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے اُن کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگا دیئے۔ دودھ کے حوض بھر دیئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے پچاس آدمی اُن کی پیشوائی کے لئے دست بستہ کھڑے تھے۔ لیکن پہلی چیز جس کی فرمائش ہوئی۔ وہ لیمونیڈ اور برف تھا۔ اسامیوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ پانی کی بوتل اس وقت وہاں آب حیات کے دا موں بک سکتا تھا۔ مگر بچارے دہقان! امیروں کے چونچلے کیا جانیں؟ مجرموں کی طرح سر جھکائے دم بخود کھڑے تھے۔ چہرہ پر خفت اور ندامت تھی۔ دلوں میں دھڑکن اور خوف۔ ایشور! بات بگڑ گئی ہے۔ اب تمہیں سنبھالو۔ برف کی ٹھنڈک نہ ملی۔ تو ٹھاکر صاحب کی پیاس کی آگ اور بھی تیز ہو گئی۔ غصہ بھڑک اٹھا کڑک کر بولے "میں شیطان نہیں ہوں۔ کہ بکروں کے خون سے پیاس بجھاؤں مجھے ٹھنڈا برف چاہیئے۔ اور یہ پیاس تمہارے اور تمہاری عورتوں کے آنسوؤں سے ہی بجھے گی۔ احسان فراموش، کم ظرف میں نے تمہیں زمین دی مکان دیئے۔ اور حیثیت دی اور اس کا صلہ یہ ہے۔ کہ میں پانی کو بھی ترستا ہوں۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ کل شام تک میں تم میں سے کسی آدمی کی صورت اس گاؤں میں نہ دیکھوں۔ ورنہ قہر ہو جائیگا۔ تم جانتے ہو کہ

کہ مجھے اپنا حکم دوہرانے کی عادت نہیں ہے۔ رات تمہاری ہے جو کچھ لے جاسکو لے جاؤ لیکن شام کو میں کسی کی منحوس صورت نہ دیکھوں۔ یہ رونا اور چیخنا فضول ہے۔ میرا دل پتھر کا ہے۔ اور کلیجہ لوہے کا۔ آنسوؤں سے نہیں پسیجتا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسری رات کو سارے گاؤں میں کوئی دیا جلانے والا تک نہ رہا۔ پھولتا پھلتا ہوا گاؤں بھوت کا ڈیرہ بن گیا۔

(۵)

عرصۂ دراز تک یہ واقعہ قرب وجوار کے منچلے قصہ گویوں کے لئے دلچسپیوں کا ماخذ بنا رہا۔ ایک صاحب نے اس پر اپنی طبع موزوں کی جولانیاں بھی دکھائیں۔ بیچارے ٹھاکر صاحب ایسے بدنام ہوئے کہ گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ بہت کوشش کی کہ گاؤں آباد ہو جائے۔ لیکن کس کی جان بھاری تھی کہ اس اندھیر نگری میں قدم رکھتا۔ جہاں فرہی کی سزا پھانسی تھی۔ کچھ مزدور پیشہ لوگ قسمت کا جوا کھیلنے آئے مگر چند مہینوں سے زیادہ نہ جم سکے۔ اجڑا ہوا گاؤں کھویا ہوا اعتبار ہے جو بہت مشکل سے جمتا ہے۔ آخر جب کوئی بس نہ چلا تو ٹھاکر صاحب نے مجبور ہو کر اراضی معاف کا عام اعلان کر دیا۔ لیکن اس رعایت نے رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ اس طرح تین سال گزر جانے کے بعد۔ ایک روز وہاں بنجاروں کا قافلہ آیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اور پورب کی طرف سے تاریکی کی لہر بڑھتی چلی آتی تھی۔ بنجاروں نے دیکھا تو سارا گاؤں ویران پڑا ہوا ہے۔ جہاں آدمیوں کے گھروں میں گدھ اور گیدڑ رہتے تھے۔ اس طلسم کا راز سمجھ میں نہ آیا۔ مکانات موجود۔ زمین زرخیز۔ سبزہ سے لہراتے ہوئے کھیت اور انسان کا نام نہیں۔ کوئی اور گاؤں قریب نہ تھا۔ وہیں فرد کش ہو گئے۔ جب صبح ہوئی،

بیلوں کے گلوں کی گھنٹیوں نے پھر اپنا نغمہ رسمیں الاپنا شروع کیا اور قافلہ گاؤں سے کچھ دُور نکل گیا تو ایک چرواہے نے جور و جبر کی یہ داستانِ طویل انہیں سُنائی۔ سیر و سیاحت نے انہیں مشکلات کا عادی بنا دیا تھا۔ آپسمیں کچھ مشورہ کیا، اور فیصلہ ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب کے درِ دولت پر جا پہنچے اور نذرانے داخل کر دیئے۔ گاؤں پھر آباد ہو گیا۔

یہ بنجارے بلا کے جفاکش، آہنی ہمت اور ارادہ کے لوگ تھے۔ جن کے آتے ہی گاؤں میں لکشمی کا راج ہو گیا۔ پھر گھروں میں سے دھوئیں کے بادل اُٹھے کولہواڑوں نے پھر دُخانی چادریں زیبِ تن کیں۔ تلسی کے چبوترے پر پھر چراغ جلے۔ رات کو رنگین طبع نوجوانوں کی الاپیں سُنائی دینے لگیں۔ سبزہ زاروں میں پھر مویشیوں کے گلّے دکھائی دیئے۔ اور کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہُوئے چرواہے کی بانسری کی مدھم اور رسیلی صدا۔ درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی اس قدرتی منظر میں جادو کی کشش پیدا کرنے لگی۔

بھادوں کا مہینہ تھا۔ کپاس کے پھولوں کی سُرخ و سفید ملاحت تل کی اودی بہار اور سن کی شوخ زردی کھیتوں میں اپنے گوقلموں حسن کے جلوے دکھاتی تھی۔ کسانوں کی منڈھیروں اور چھپروں پر بھی گل و ثمر کی رنگ آمیزیاں نظر آتی تھیں۔ اسپر پانی کی ہلکی ہلکی پھواریں حسنِ قدرت کیلئے مشاطہ کا کام دے رہی تھیں۔ جسطرح عارفوں کے دل نورِ حقیقت سے لبریز ہوتے ہیں۔ اُسی طرح ساگر اور تالاب شفاف پانی سے لبریز تھے۔ شائد راجہ اندر کیلاش کی تراوت بیز بلندیوں سے اُتر کر اب میدانوں میں آنے والے تھے۔ اسی لئے سیر چشم قدرت نے حسن اور برکت اور اُمید کے توشے خانے کھول دیئے

تھے۔ وکیل صاحب کو بھی تمنائے سیر نے گدگدایا۔ حسب معمول اپنے رئیسانہ کروفر کے ساتھ گاؤں میں آ پہنچے۔ دیکھا تو قناعت اور فراغت کی برکتیں چاروں طرف نمودار تھیں۔

(۶)

گاؤں والوں نے اُن کی تشریف آوری کی خبر سُنی۔ سلام کو حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے انہیں اچھے اچھے کپڑے پہنے۔ خودداری کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے دیکھا اُن سے بہت خندہ پیشانی سے ملے۔ فصل کی کیفیت پوچھی۔ بُوڑھے ہرداس نے ایک ایسے لہجہ میں جس سے کامل ذمہ داری اور امامت کی شان ٹپکتی تھی۔ جواب دیا۔ "حضور کے قدموں کی برکت سے سب چین ہے۔ کسی طرح کی تکلیف نہیں آپ کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہیں اور آپ کا جس گاتے ہیں۔ ہمارے راجہ اور سرکار جو کچھ ہیں آپ ہیں اور آپ کیلئے جان تک حاضر ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ "میں اپنی خوش آمد سُننے کا عادی نہیں ہوں۔" بوڑھے ہرداس کی پیشانی پر بل پڑے غرور کو چوٹ لگی۔ "بولا۔ مجھے بھی خوشامد کرنیکی عادت نہیں ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے اینٹھ کر جواب دیا۔ "تمہیں رئیسوں سے بات کرنیکی تمیز نہیں۔ طاقت کی طرح تمہاری عقل بھی بڑھاپے کی نذر ہو گئی۔"

ہرداس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ غصہ کی حرارت سے سب کی آنکھیں پھیلی اور استقلال کی سردی سے ماتھے سکڑے ہوئے تھے۔ بولا۔ "ہم آپکی رعیت ہیں لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے۔ اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دیدیں۔ آبرو

نہیں دے سکتے۔"

ہرداس کے کئی منچلے ساتھیوں نے بلند آواز میں تائید کی۔ آبرو جان کے پیچھے ہے۔ ٹھاکر صاحب کے غصّہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ زور سے بولے "تم لوگ زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ جسطرح گلے میں جھولیاں لٹکائے آئے تھے۔ اُسیطرح نکال دیئے جاؤ گے۔ میں رگھو دمن سنگھ ہوں۔ جس نے تم جیسے کتنے ہی ہیکڑوں کو اسی جگہ پیروں سے کچلوا ڈالا ہے" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے رسالے کے سردار ارجن سنگھ کو بلا کر کہا۔ "ٹھاکر! اب ان چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں۔ کل شام تک ان حشرات سے میرا گاؤں پاک و صاف ہو جائے۔"

ہرداس کھڑا ہو گیا۔ غصّہ اب چنگاری بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ بولا "ہم نے اس گاؤں کو چھوڑنے کیلئے نہیں بسایا ہے۔ جبتک جئیں گے۔ اسی گاؤں میں رہیں گے۔ یہیں پیدا ہوں گے اور یہیں مریں گے۔ آپ بڑے آدمی ہیں اور بڑوں کی سمجھ بھی بڑی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اکھڑ گنوار ہیں۔ ناحق غریبوں کی جان کے پیچھے نہ پڑیئے۔ خون خرابہ ہو جائیگا۔ لیکن آپکو یہی منظور ہے تو ہماری طرف سے بھی آپ کے سپاہیوں کو چھٹی ہے۔ جب چاہیں دل کے ارمان نکال لیں۔"

اتنا کہہ کر ٹھاکر صاحب کو سلام کیا۔ اور چل دیا۔ اس کے ساتھی بھی پر غرور انداز کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلے۔ ارجن سنگھ نے ان کے تیور دیکھے۔ سمجھ گیا کہ لوہے کے چنے ہیں۔ لیکن شہدوں کا سرغنہ تھا۔ کچھ اپنے نام کی لاج تھی۔ دوسرے دن شام کیوقت جب رات اور دن میں مٹھ بھیڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں جماعتوں کا سامنا ہوا۔ پھر وہ دھول دھپا ہوا۔ کہ زمین تھرا گئی۔ زبانوں نے منہ کے اندر وہ معرکے دکھائے

کہ آفتاب مارے خوف کے بچھم میں جا چھپا۔ تب لاٹھیوں نے سر اٹھایا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی دوا اور شکریہ کے مستحق ہوں۔ ارجن سنگھ نے دانش مندی سے کام لیا۔ تاہم ان کے چند آدمیوں کیلئے گڑ اور ہلدی پینے کے سامان ہو چکے تھے۔

وکیل صاحب نے اپنی فوج کی یہ حالت زار دیکھی۔ کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے کسی کے جسم پر گرد جمی ہوئی۔ کوئی ہانپتے ہانپتے بیدم۔ خون بہت کم نظر آیا۔ کیونکہ یہ ایک بے بہا جنس ہے۔ اور اسے ڈنڈوں کی زد سے بچالیا گیا تھا۔ تو انہوں نے ارجن سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور ان کی شجاعت و جانبازی کی خوب داد دی۔ رات کو ان کے سامنے لڈو اور امرتیوں کی ایسی بارش ہوئی۔ کہ یہ سب گرد و غبار دھل گیا۔ صبح کو اس رسالے نے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لی۔ اور قسم کھا گئے۔ کہ اب بھول کر بھی اس گاؤں کا رخ نہ کرینگے۔

تب ٹھاکر صاحب نے گاؤں کے آدمیوں کو چوپال میں طلب کیا۔ ان کے اشارہ کی دیر تھی۔ سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ تو ٹھاکر صاحب ایک ایک کر کے ان سے بغل گیر ہوئے اور کہا۔ "میں ایشور کا بہت مشکور ہوں۔ کہ مجھے اس گاؤں کے لئے جن آدمیوں کی تلاش تھی۔ وہ لوگ مل گئے۔ آپکو معلوم ہے کہ یہ گاؤں کئی بار اجڑا۔ اور کئی بار بسا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ میں ان کا دشمن نہیں تھا لیکن میری دلی آرزو یہ تھی۔ کہ اس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں جو ظلم و ستم کا مردوں کیطرح سامنا کریں۔ جو اپنے حقوق اور رعائتوں کی مردوں کی طرح حفاظت کریں۔ جو حکومت کے غلام نہ ہوں۔ جو رعب اور اختیار کی تیز نگاہ دیکھ

کر بچوں کی طرح خوف سے سہم نہ جائیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ بہت نقصان اور ندامت اور بدنامی کے بعد میری تمنائیں پوری ہو گئی ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ آپ ناموافق ہواؤں اور متلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔ میں آج اس گاؤں سے دست بردار ہوتا ہوں۔ آج سے یہ آپکی ملکیت ہے۔ آپ ہی اس کے زمیندار اور مختار ہیں۔ ایشور سے میری یہی دعا ہے کہ آپ پھولیں پھلیں اور سر سبز ہوں۔"

ان الفاظ نے دلوں پر تسخیر کا کام کیا۔ لوگ آقا پرستی کے جوش سے مست ہو ہو کر ٹھاکر صاحب کے پیروں سے لپٹ گئے۔ اور کہنے لگے "ہم آپ کے قدموں سے جیتے جی جدا نہ ہوں گے۔ آپ کا سا مربی اور قدر دان اور رعایا پرور بزرگ ہم کہاں سے پائیں گے؟"

جانبازانہ عقیدت اور ہمدردی اور وفاداری اور احسان کا ایک بڑا دردناک اور موثر نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو گیا۔ لیکن ٹھاکر صاحب اپنے فیاضانہ ارادہ پر ثابت قدم رہے۔ اور گو پچاس سال سے زائد گزر گئے ہیں۔ لیکن انہی بنجاروں کے ورثا ابھی تک موضع صاحب گنج کے معافی دار ہیں عورتیں ابھی تک ٹھاکر دیودمن سنگھ کی پوجا اور منتیں کرتی ہیں۔ اور گو اب اس موضع کے کئی نوجوان دولت اور حکومت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بوڑھے اور کھرے ہری داس کے نام پر اب بھی فخر کرتے ہیں۔ اور بھادوں سدی ایکادشی کے دن اب بھی اس مبارک فتح کی یادگار میں جشن منائے جاتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

اندھیر

(۱)

ناگ پنچمی آئی۔ ساٹھے کے زندہ دل نوجوانوں نے خوش رنگ جانگھیے بنوائے اکھاڑے میں ڈھول کی مردانہ صدائیں بلند ہوئیں۔ قرب و جوار کے زور آزما اکٹھے ہوئے اور اکھاڑے پر تمبولیوں نے اپنی دوکانیں سجائیں۔ کیونکہ آج زور آزمائی اور دوستانہ مقابلے کا دن ہے۔ عورتوں نے گوبر سے اپنے آنگن لیپے اور گاتی بجاتی کٹوروں میں دودھ چاول لئے ناگ پوجنے چلیں۔

ساٹھے اور پاٹھے دو ملحق موا‌ضع تھے۔ دونوں گنگا کے کنارے زراعت میں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اسی لئے آپس میں فوجداریوں کی گرم بازاری تھی۔ ازل سے اُن کے درمیان رقابت چلی آتی تھی۔ ساٹھے والوں کو یہ زعم تھا۔ کہ اُنہوں نے پاٹھے والوں کو کبھی سر نہ اُٹھانے دیا۔ علیٰ ہذا پاٹھے والے اپنے رقیبوں کو زک دینا ہی زندگی کا مقدم کام سمجھتے تھے۔ انکی تاریخ

فتوحات کی روائتوں سے بھری ہوئی تھی۔ پاٹھے کے چرواہے یہ گیت گاتے ہوئے چلتے تھے۔

سائیٹے والے کائیہ سگرے۔ پاٹھے والے ہیں سردار
اور سائیٹے کے دھوبی گاتے۔

ساٹھے والے ساٹھ ہاتھ کے۔ جن کے ہاتھ سدا تروار
اُن لوگوں کے جنم نسائے۔ جن ماٹھے ماں لین اوتار

غرض رقابت کا یہ جوش بچوں میں ماں کے دودھ کے ساتھ داخل ہوتا تھا۔ اس کے اظہار کا سبب موزوں اور تاریخی موقع یہی ناگ پنچمی کا دن تھا۔ اس دن کیلئے سال بھر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج اُن میں معرکے کی کُشتی ہونیوالی تھی۔ ساٹھے کو گوپال پہ ناز تھا۔ پاٹھے کو بلدیو کا غرہ۔ دونوں سُورما اپنے اپنے فریق کی دُعائیں اور آرزوئیں لئے ہوئے اکھاڑے میں اُترے۔ تماشائیوں پر مرکزی کشش کا اثر ہوا۔ موضع کے چوکیداروں نے لٹھ اور ڈنڈوں کا یہ جمگھٹ دیکھا۔ اور مردوں کی انگارے کی طرح لال آنکھیں۔ تو تجربہ سابقہ کی بنا پر بے نتہ ہو گئے۔ ادھر اکھاڑے میں داؤ پیچ ہوتے رہے۔ بلدیو اُلجھتا تھا گوپال پینترے بدلتا تھا۔ اُسے اپنی طاقت کا زعم تھا۔ اِسے اپنے کرتب کا بھروسہ۔ کچھ دیر تک اکھاڑے سے خم ٹھونکنے کی آوازیں آوازیں آتی رہیں۔ تب یکایک بہت سے آدمی خوشی سے نعرہ کر مار مار اُچھلنے لگے۔ کپڑے اور برتن اور پیسے اور بتاشے لٹائے جانے لگے۔ کسی نے اپنا پُرانا صافہ پھینکا کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اُڑا دی۔ ساٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے۔ اور گوپال کو گود میں اُٹھا لائے۔ بلدیو اور اُس کے رقیبوں نے

گوپال کو لہو کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور دانت پیس کر رہ گئے۔

(۲)

دس بجے رات کا وقت اور ساون کا مہینہ۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تاریکی کا یہ عالم تھا۔ گویا روشنی کا وجود ہی نہیں رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ مگر تاریکی کو اور زیادہ تاریک کرنے کیلئے مینڈکوں کی آواز زندگی کا پتہ دیتی تھی۔ ورنہ چاروں طرف موت تھی۔ خاموش، خوفناک اور متین ساٹھے کے جھونپڑے اور مکانات اس اندھیرے میں بہت غور سے دیکھنے پر کالی کالی بھیڑوں کیطرح نظر آتے تھے۔ نہ بچے روتے تھے۔ نہ عورتیں گاتی تھیں۔ پیران پارسا رام نام بھی نہ جپتے تھے۔

آبادی سے بہت دُور کئی پُرشور نالوں اور ڈھاک کے جنگلوں سے گزر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے اور اُن کی مینڈھوں پر ساٹھے کے کسان، جا بجا منڈیا ڈالے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کر رہے تھے۔ تلے زمین۔ اوپر تاریکی میلوں تک سناٹا چھایا ہوا۔ کہیں جنگلی سوروں کے غول۔ کہیں نیل گائیوں کے ریوڑ۔ چلم کے سوا کوئی ساتھی نہیں۔ آگ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ ذرا کھٹکا ہوا اور چونک پڑے۔ تاریکی خوف کا دوسرا نام ہے۔ جب ایک مٹی کا ڈھیر۔ ایک ٹھونٹھا درخت اور ایک تودہ کاہ بھی متحرک اور حساس بن جاتے ہیں۔ تاریکی ان میں جان ڈال دیتی ہے۔ لیکن یہ مضبوط ہاتھوں والے۔ مضبوط جگر والے۔ مضبوط ارادے والے کسان ہیں۔ کہ یہ سب سختیاں جھیلتے ہیں۔ تاکہ اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کیلئے عیش اور تکلف کے سامان بہم پہنچائیں۔ انہیں رکھوالوں میں

آج کا ہیرو ساٹھے کا مایۂ ناز گوپال بھی ہے۔ جو اپنی منڈیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور نیند کو بھگانے کے لئے دھیمے سُروں میں یہ نغمہ گا رہا ہے۔

میں تو تو سے نینا لگائے پچھتائی رے

دفعتاً اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ جیسے ہرن کُتوں کی آوازوں کو کان لگا کر سُنتا ہے۔ اسی طرح گوپال نے بھی کان لگا کر سُنا۔ نیند کی غنودگی دُور ہو گئی۔ لٹھ کندھے پہ رکھا۔ اور منڈیا سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سیاہی چھائی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اور رات پر وہیں بے سُدھ پڑا رہا معلوم نہیں اس پر کتنی چوٹیں پڑیں۔ حملہ آوروں نے تو اپنی دانست میں اس کا کام تمام کر ڈالا۔ لیکن حیات باقی تھی۔ یہ پاٹھے کے غیرتمند لوگ تھے۔ جنہوں نے اندھیرے کی آڑ میں اپنی ہار کا بدلہ لیا تھا۔

(۳)

گوپال ذات کا اہیر تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا تو شمع جسم کیوں گھلتی۔ پورے چھ فٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ للکار کر گاتا۔ تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتے۔ ساون میں ملار اور بھجن تو روز مرہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ کے وجود پر اُسے عالمانہ شکوک تھے۔ لیکن جسطرح شیر اور چیتا بھی سُرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں۔ اُسی طرح سُرخ صافے سے اُس کی روح لرزاں ہو جاتی تھی۔ اگر ساٹھے کے ایک جوان ہمت سورما کے لئے

یہ بے معنی خوف غیر معمولی بات تھی۔ لیکن اس کا کچھ بس نہ تھا۔ سپاہی کی وہ خوفناک تصویر جو بچپن میں اس کے دل پر کھنچ گئی تھی۔ نقش کالحجر بن گئی تھی۔ شرارتیں گئیں، بچپن گیا، مٹھائی کی بھوک گئی۔ لیکن سپاہی کی تصویر ابھی تک قائم تھی۔ آج اس کے دروازے پر سُرخ صافے والوں کی ایک فوج جمع تھی۔ لیکن گوپال زخموں سے چور، درد سے بیتاب ہونے پر بھی اپنے مکان کے ایک تاریک گوشے میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ نمبردار اور مکھیا، پٹواری اور چوکیدار مرعوب انداز سے کھڑے داروغہ کی خوشامد کر رہے تھے۔ کہیں اہیر کی داد فریاد سنائی دیتی تھی۔ کہیں مودی کی گریہ زاری، کہیں تیلی کی چیخ و پکار، کہیں قصاب کی آنکھوں سے لہو جاری، کلار کھڑا اپنی قسمتوں کو رو رہا تھا۔ فحش اور مغلظات کی گرم بازاری تھی۔ داروغہ جی نہایت کالگزار افسر تھے۔ گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے۔ مہتر نے آکر فریاد کی۔ "حضور انڈے نہیں ہیں!"

داروغہ جی ہنٹر لیکر دوڑے اور اس غریب کا بھرکس نکال دیا۔ سارے گاؤں میں ہلچل پڑی ہوئی تھی۔ کانسٹیبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے۔ گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں۔ جب گاؤں کے سارے آدمی آ گئے، تو داروغہ جی نے افسرانہ انداز تحکم سے فرمایا۔ "موضع میں ایسی سنگین واردات ہوئی اور اس بدقسمت گوپال نے رپٹ تک نہ کی!"

مکھیا صاحب بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے بولے۔ "حضور اب معافی دی جائے!"

داروغہ جی نے غضبناک نگاہوں سے اس کیطرف دیکھ کر کہا: "یہ اُس کی شرارت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اخفارِ جرم ارتکابِ جرم کے برابر ہے۔ میں اس بدمعاش کو اس کا مزہ چکھا دوں گا۔ وُہ اپنی طاقت کے زعم میں پھُولا ہوا ہے۔ اور کوئی بات نہیں۔ لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانتے!"

مکھیا صاحب سر بسجود ہو کر بولے "حضور اب معافی دی جائے۔"

داروغہ جی چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اور جھنجھلا کر بولے "ارے حضور کے نیچے! کچھ سٹھیا تو نہیں گیا ہے۔ اگر اسی طرح معافی دینی ہوتی تو مجھے کیا کُتّے نے کاٹا تھا۔ کہ یہاں تک دوڑا آتا؟ نہ کوئی معاملہ نہ معاملے کی بات بس معافی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں۔ جبتک تم اپنا صلاح مشورہ کر لو۔ اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔ ورنہ غوث خاں کو جانتے ہو۔ اُس کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

داروغہ تقویٰ و طہارت کے بڑے پابند تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے۔ اور تیسوں روزے رکھتے۔ عیدوں میں دھوم دھام سے قربانیاں ہوتیں۔ اس سے زیادہ حسن ارادت کسی انسان میں اور کیا ہو سکتا ہے؟

(۴)

مکھیا صاحب دبے پاؤں رازدارانہ انداز سے گورا کے پاس آئے اور بولے "یہ داروگا بڑا کا پھر ہے۔ پچاس سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتا۔ درجہ اوّل کا تھانے دار ہے۔ میں نے بہت کہا۔ حضور غریب آدمی ہے۔ گھر میں کچھ سُبھیتا نہیں۔ مگر وہ ایک نہیں سُنتا۔"

گوڑا نے گھونگٹ میں مُنہ چھپا کر کہا۔" دادا ان کی جان بچ جائے۔ کسی طرح کی آنچ نہ آنے پائے۔ روپے پیسے کی کون بات ہے۔ اسی دِن کیلئے تو کمایا جاتا ہے۔"

گوپال کھاٹ پر پڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ لکڑی گانٹھ ہی پر ٹوٹتی ہے۔ ناکردہ گناہ دبتا ہے۔ مگر کچلا نہیں جاسکتا۔ وہ جوش سے اُٹھ بیٹھا اور بولا۔" پچاس روپیہ کی کون کہے۔ میں پچاس کوڑیاں بھی نہ دُوں گا۔ کوئی گدر ہے۔ میں نے کسور (قصور) کیا کیا ہے۔"

مکھیا کا چہرہ فق ہو گیا۔ بزرگانہ لہجے میں بولے۔" رساں رساں (آہستہ آہستہ) بولو۔ کہیں سُن لے تو غضب ہو جائے۔"

لیکن گوپال بپھرا ہوا تھا۔ اکڑ کر بولا۔" میں ایک کوڑی بھی نہیں دوں گا۔ دیکھیں کون میرے پھانسی لگا دیتا ہے۔"

گوڑا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔" اچھا جب میں تُم سے روپے مانگوں تو مت دینا۔" یہ کہہ کر گوڑا نے جو اس وقت لونڈی کے بجائے رانی بنی ہوئی تھی۔ چھپر کے ایک کونے میں سے روپیوں کی ایک پوٹلی نکالی اور مکھیا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ گوپال دانت پیس کر اُٹھا۔ لیکن مکھیا صاحب فوراً سے پہلے سرک گئے۔ داروغہ جی نے گوپال کی باتیں سُن لی تھیں۔ اور دُعا کر رہے تھے۔ کہ" اے خدا اس مردود شقی کو تالیف قلب کر۔" اتنے میں مکھیا نے باہر آکر پچیس روپے کی پوٹلی دکھائی۔ پچیس راستے میں غائب ہو گئے تھے۔ داروغہ جی نے خدا کا شکر کیا۔ دعا مستجاب ہوئی۔ روپیہ جیب میں رکھا اور رسد پہنچانے والے انبوہ کثیر

رہتے تھے اور بلبلاتے چھوڑ کر مر گئے۔ مودی کا گلا گھٹ گیا۔ قصاب کے گلے پر چھری پھر گئی۔ تیلی پس گیا۔ مکھیا صاحب نے گوپال کی گردن پر احسان رکھا۔ گویا سود کے دام گرہ سے دیئے۔ گاؤں میں سرخرو ہو گئے۔ وقار بڑھ گیا۔ ادھر گوپال نے گورا کی خوب خبر لی۔ گاؤں میں رات بھر یہی چرچا رہا۔ گوپال بہت بچا۔ اور اس کا سہرا مکھیا کے سر تھا۔ بلائے عظیم آئی تھی۔ وہ ٹل گئی۔ پتروں نے۔ دیوان ہردول نے۔ نیم تلے والی دیوی نے۔ تالاب کے کنارے والی ستی نے گوپال کی رکھشا کی۔ یہ انہیں کا پرتاپ تھا۔ دیوی کی پوجا ہونی ضروری تھی۔ ستیہ نارائن کی کتھا بھی لازمی ہو گئی۔

(۵)

پھر صبح ہوئی۔ لیکن گوپال کے دروازے پر آج سرخ پگڑیوں کے بجائے لال ساڑھیوں کا جمگھٹ تھا۔ گورا آج دیوی کی پوجا کرنے جاتی تھی۔ اور گاؤں کی عورتیں اس کا ساتھ دینے آئی تھیں۔ اس کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جو خس اور گلاب سے کم دلآویز نہ تھی۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں۔ بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے تھے۔ دیوی کے چبوترے پر اس نے مٹی کا ہاتھی چڑھایا۔ ستی کی مانگ میں سیندور ڈالا۔ دیوان صاحب کو بتاشے اور حلوہ کھلایا۔ ہنومان جی کو لڈو سے زیادہ رغبت ہے۔ انہیں لڈو چڑھائے تب گاتی بجاتی گھر کو آئی۔ اور ستیہ نارائن کی کتھا کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مالن پھولوں کے ہار کیلے کی شاخیں اور بندھن واریں لائیں۔ کمہار نئے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گیا۔ باری ہرے ڈھاک کے پتل اور دونے رکھ گیا۔ کہار نے آکر مٹکوں میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے آکر گوپال اور گورا کے لئے دو نئی

نئی پیڑھیاں بنائیں۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ دروازے پر بندھن واریں بندھ گئیں۔ آنگن میں کیلے کی شاخیں گڑھ گئیں۔ پنڈت جی کے لئے سنگھاسن سج گیا۔ فرائض باہمی کا نظام خود بخود اپنے مقررہ دائرے پر چلنے لگا۔ یہی نظام تمدن ہے۔ جس نے دیہات کی زندگی کو تکلفات سے بے نیاز بنا رکھا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب ادنیٰ اور اعلیٰ کی بے معنی اور بیہودہ قیود نے ان باہمی فرائض کو امدادِ حسنہ کے رتبہ سے ہٹاکر ان پر ذلت اور نیچ پن کا داغ لگا دیا ہے۔

شام ہوئی پنڈت موٹے رام جی نے کندھے پر جھولی ڈالی، ہاتھ میں سنکھ لیا اور کھڑاؤں پر کھٹ پٹ کرتے گوپال کے گھر آ پہنچے۔ آنگن میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ گاؤں کے معززین کتھا سننے کیلئے آ بیٹھے۔ گھنٹی بجی، سنکھ پھونکا گیا اور کتھا شروع ہوئی۔ گوپال بھی گاڑھے کی چادر اوڑھے ایک کونے میں دیوار کے آسرے سے بیٹھا ہوا تھا۔ مکھیا، نمبردار۔ اور پٹواری نے ازراہِ ہمدردی اس سے کہا۔ "ستیہ نارائن کی مہما تھی۔ کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئی"۔ گوپال نے انگڑائی لے کر کہا۔ "ستیہ نارائن کی مہما نہیں یہ اندھیر ہے"۔

٭ ٭ ٭

مشتعل ہدایت

(۱)

الہ آباد کے تعلیم یافتہ حلقہ میں پنڈت دیورتن شرما کی ذات غنیمت تھی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم اور خاندانی وقار کی بنا پر گورنمنٹ نے انہیں ایک معزز خدمت پر مامور کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے آزادی کو ہاتھ سے دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے چند خیر خواہ احباب نے بہت سمجھایا۔ کہ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو سرکاری ملازمت بڑے نصیبوں سے ملتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ اس کیلئے ترستے ہیں۔ اور اس کی آرزو لئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ خاندان کا نام روشن کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اسے الہ دین کا چراغ سمجھو۔ ثروت اور اعزاز اور شہرت یہ سب اس کے غلام ہیں۔ رہ گئی قومی خدمت! تو کبھی قوم کے لئے تمہیں کیوں مرتے ہو؟ اس شہر میں بڑے بڑے عالی دماغ صاحب ثروت اصحاب ہیں۔ جو بنگلوں میں شان سے رہتے ہیں۔ اور موٹروں

پر گرد و غبار کا طوفان اڑاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ کیا وہ قوم کے خادم نہیں ہیں؟ حسب ضروریات یا موقع آتا ہے۔ تو وہ قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ ابھی جب میونسپل ووٹ کا معاملہ درپیش تھا۔ تو میونسپل ہال کے احاطہ میں فٹن اور موٹروں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اور ہال کے اندر قومی نعروں اور تقریروں کا۔ مگر ان میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنے ذاتی فوائد کو بالائے طاق رکھ دیا ہو؟ دنیا کا دستور ہے کہ پہلے گھر میں چراغ جلا کر تب مسجد میں چراغ جلاتے ہیں۔ یہ قومی چرچے کالج ہی کیلئے مخصوص ہیں۔ یا اُس زمانہ کیلئے جبتک انسان کو اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بے کار نہ رہے بیگار ہی کی۔ جب کاروبار چل گیا تو پھر کہاں کی قوم اور کہاں کے قومی چرچے! یہی سارے زمانہ کا دستور ہے۔ تو تمہیں کو قوم کا قاضی بننے کی کیا ضرورت ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ سرکاری ملازمت میں قومی خدمت کے جتنے موقعے ملتے ہیں۔ اتنے کسی اور حالت میں نہیں مل سکتے۔ ایک رحمدل داروغہ سینکڑوں قوم پرستوں سے بہتر ہے۔ ایک منصف مزاج فرض شناس میجسٹریٹ ہزاروں قومی نعرہ بازوں سے زیادہ قومی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں لاگ چاہیئے۔ انسان جس حالت میں ہو، قوم کو کچھ نہ کچھ نفع اپنی ذات سے پہنچا سکتا ہے۔ شرما جی اس آخری دلیل کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے۔ مگر قائل ہو نیر بھی اُن کے دل کو اطمینان نہ ہوا خواہ اصولاً خواہ محض سہل انگاری اور آرام طلبی کے باعث جو اکثر ایسی حالت قومی خدمت کا درجہ پا جاتی ہے۔ انہوں نے ملازمت سے دُور رہنے ہی کا فیصلہ کیا۔ اُن کے اس فیصلہ پر کالج کے پُرجوش طلبا نے انہیں مبارکبادیں دیں۔ اور اس

قومی فتح پر ایک ڈرامہ کھیلا گیا۔ جس کے ہیرو شرما جی ہی تھے۔ اونچے حلقوں میں جابجا اس ایثار کا چرچا ہوا۔ اور شرما جی کو قومی دائرہ میں قدم رکھتے ہی کافی شہرت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ وہ کئی سال سے قومی خدمت کرتے تھے۔ اور اس خدمت کا بیشتر حصہ اخباروں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ جو بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کا قومی کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ اخباروں اور رسالوں کیلئے مضامین لکھتے۔ قومی جلسے منعقد کرتے۔ فری لائبریری کے سیکرٹری، سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے صدر، سوشل سروس لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور پرائمری ایجوکیشن کمیٹی کے پُرجوش ممبر تھے۔ قومی رفاہ و فلاح کی تجویزیں شب و روز ان کے دماغ میں گونجا کرتیں۔ زراعت کی ترقی سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ رسالوں میں جہاں کسی نئی کھاد یا نئی پیداوار کا ذکر دیکھتے۔ فوراً سُرخ پنسل سے نوٹ کر دیتے۔ اور اپنی تقریروں میں اس کا حوالہ دیتے۔ مگر باوجودیکہ شہر سے تھوڑی ہی دوری پر اُن کا ایک بڑا موضع تھا۔ اپنے کسی اسامی سے رُوشناس نہ تھے۔ یہاں تک کہ الہ آباد ہی میں گورنمنٹ کے زراعتی فارم کی سیر کرنے کبھی نہ گئے تھے۔

(۲)

اسی محلہ میں ایک لالہ بالو لال رہتے تھے۔ ایک وکیل کے محرر تھے۔ تھوڑی سی اردو ہندی جانتے تھے۔ مگر اپنا قانونی کام اچھی طرح کر سکتے تھے۔ وضع قطع بھدی اور جسم بھی کچھ بہت سڈول نہ تھا۔ مو کے چارخانے کی لمبی اچکن ایسے بیڈول اور غیر متناسب جسم پر بہت نظر فریب نہ ہو سکتی تھی۔

جوتا بھی ویسا ہی پہنتے تھے، اور باوجودیکہ بیچارے اکثر کڑوے تیل سے اس کی مالش کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنی گرانباری کا انتقام لینے سے نہ چوکتا تھا۔ منشی جی سال کے چھ مہینے برابر پیروں میں مرہم لگاتے رہتے تھے۔ جوتا ان کے پیروں کا محافظ نہیں۔ اُن کی آبرو کا نگہبان تھا۔ اوائل عمر میں کچھ دنوں تک شرما جی کے ہم سبق رہے تھے۔ اس رشتے سے کبھی کبھی ان کے پاس آیا کرتے۔ شرما جی کو ان کا آنا بہت ناگوار گزرتا تھا۔ بالخصوص جب وہ خوش لباس اور خوش تقریر احباب کی موجودگی میں آجاتے اور منشی جی بھی کچھ ایسے کم نگاہ تھے، کہ ان میں اپنا آن ملاپن مطلق نظر نہ آتا۔ بلکہ ایسے موقعوں پہ وہ ضرور آ پہنچتے۔ اور سب سے بڑا ستم یہ کہ برابر کرسی پر ڈٹ جاتے۔ جیسے منسوں میں کوا۔ اس وقت یہ لوگ انگریزی میں باتیں کرنے لگتے، اور بابو لال کو کم فہم، مخبوط الحواس، بدھو، ایکسینٹرک، وغیرہ معزز القاب سے یاد کرتے۔ ان پر پھبتیاں چُست کرتے۔ ہاں شرما جی کی یہ شرافت تھی، کہ وہ اپنے ناموقع شناس دوست کو حتے الامکان تضحیک سے بچاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابو لال کو شرما جی سے سچی ارادت تھی۔ وہ ان کی قومی تجاویز کو بڑے غور سے سنتا اور دل میں اُنکی پرستش کرتا تھا۔

(۳)

ایک بار الہ آباد میں عین جیت کے مہینہ میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ رؤسا شہر نکل بھاگے۔ محلے ویران ہو گئے۔ غربا مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ شرما جی نے بھی سامان سفر درست کیا۔ لیکن "سوشل سروس لیگ" کے سیکرٹری تھے۔

ایسے موقعہ پر نکل جانے میں بدنامی کا خوف تھا کسی حیلہ کی فکر ہوئی۔ "لیگ" میں زیادہ تر کالج اور سکول کے طلبا تھے۔ اُن کی ایک میٹنگ کی۔ اور یوں قومی خدمت کی تلقین فرمائی۔

"دوستو! آپ اس بدنصیب قوم کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ اس دلیر اور لرزاں کے سہارے ہیں۔ ہمارے سر پر آج آفت آئی ہوئی ہے۔ ان آفتوں میں ہماری نگاہیں آپکی طرف نہ اُٹھیں تو کس کی طرف اُٹھیں گی؟ دوستو! زندگی میں قومی خدمت کے ایسے موقعے نہ ملیں گے۔ ثابت کردو۔ کہ تم مردوں کا دل رکھتے ہو۔ جو حوادث روزگار سے نہیں ڈرتا۔ ہاں دنیا کو دکھا دو کہ ہندوستان جس نے بھرت اور ہریشچندر پیدا کئے۔ وہ آج بھی ایثار اور قربانی سے خالی نہیں ہے۔ جس قوم کے نوجوانوں میں حرارت اور زندگی ہے۔ وہ قوم دُنیا میں ہمیشہ زندہ اور نیک نام رہے گی۔ آیئے ہم کمر ہمت باندھیں۔ بیشک راستہ خطرناک ہے۔ کام مشکل ہے۔ آپکو اپنے آرام اور تکلفات اور فیشن ایبل ظاہر داریوں کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ بعض اوقات تم ہچکچاؤ گے ہٹو گے اور مُنہ پھیر لو گے۔ مگر بھائیو! یہ ہمارے ہاتھ اگر قوم کے کام نہ آئیں تو کس کام کے؟ اگر یہ ہمارے پیر قوم کی چاکری میں نہ دوڑیں تو کس کام کے؟ کاش میں اس خدمت میں تمہارا ہاتھ بٹا سکتا۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں حالات سے مجبور ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیہات کے بھائیوں کی جو کچھ خدمت ہو سکے وہ انجام دوں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ اپنے قومی فرائض کو دل و جان سے ادا کریں گے۔ اور اُمید کرتا ہوں

کہ واپسی پر میں بھی شاید آپ کی خدمت میں کچھ اضافہ کر سکوں گا۔
اس کے بعد پروگرام تیار ہوا۔ مختلف خدمات کیلئے جدا جدا جماعتیں قائم کی گئیں۔ کوئی تیمارداری کیلئے، کوئی دوا فروشی کیلئے۔ کوئی لاشوں کو جلانے کیلئے یا دفن کرنے کیلئے۔ اس طرح شرما جی نے اپنا گلا چھڑایا۔ اور شام کو اپنی ٹم ٹم پر سوار ہو کر اسباب سفر لئے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے مگر طبیعت کچھ گری ہوئی تھی۔ اپنی کم ہمتی اور کمزوری پر دل میں نادم تھے۔
سوء اتفاق سے اسٹیشن پر ان کے ایک بے تکلف دوست مل گئے یہ وہی وکیل صاحب تھے۔ جنکی کرسیٔ وزارت پر منشی بابو لال رونق افروز تھے، بھاگے جا رہے تھے۔ شرما جی کو دیکھ کر پوچھا "کیوں جناب کہاں کا قصد ہے، بھاگ کھڑے ہوئے؟"
شرما جی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سنبھل کر بولے "بھاگوں کیوں؟"
وکیل صاحب :- "یہ سارا شہر کس لئے بھاگا جا رہا ہے؟"
شرما جی :- "میں ایسا بزدل۔ فرض ناشناس نہیں ہوں"
وکیل صاحب :- یار کیوں باتیں بناتے ہو۔ اچھا بتاؤ۔ کہاں جاتے ہو؟"
شرما جی :- بعض دیہات میں بیماری پھیل رہی ہے۔ وہاں پر کچھ ریلیف کا کام کروں گا۔"
وکیل :- سراسر غلط ہے ابھی میں ڈسٹرکٹ گزٹ دیکھے آتا ہوں۔ شہر کے باہر بیماری کا نام بھی نہیں ہے۔"

شرما جی لاجواب ہو کر بھی بحث کر سکتے تھے۔ دل قائل ہو جائے پر زبان نہ قائل ہوتی تھی۔ بولے "ڈسٹرکٹ گزٹ کو آپ وحی سمجھتے ہوں گے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

وکیل:- "تو کیا آپ کے کان میں فرشتے کہہ گئے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ کہ جان کے ڈر کے مارے بگٹٹ بھاگا جا رہا ہوں۔"

شرما جی:- "اچھا بالفرض ایسا ہی سہی۔ تو کیا گناہ کر رہا ہوں۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔"

وکیل:- "ہاں اب آئے راہ پر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ اپنی جان بچانا قدرت کا پہلا قانون ہے۔ لیکن اب بھول کر بھی قوم پرستی کا دعوےٰ نہ کیجیئے گا۔ اس کے لئے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے۔ تن پروری اور قوم پرستی میں بعد المشرقین ہے۔ قوم کا خادم قوم پر مٹ جاتا ہے۔ اپنے تئیں قوم پر نثار کر دیتا ہے۔ تب اُسے یہ آسمانی اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ کم سے کم میں اخبار بینی کو قوم پرستی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اب کبھی بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کیجیئے گا۔ گویا آپ کو اپنے سوا سارے جہان کو خود غرض، خود پرور، خود مطلب کہنے کا حق حاصل ہے۔"

شرما جی نے اس دریدہ دہنی کا کچھ جواب نہ دیا۔ حقارت سے مُنہ پھیر لیا۔ اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

جمنا پار تین سٹیشنوں کے بعد شرما جی کا ایک موضع تھا۔ مختار صاحب سواری لئے حاضر تھے۔ شرما جی اپنے وکیل دوست کی لعن وطعن پر دل میں پیچ و تاب کھاتے اُتر ے۔ وہ حضرت بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہنس کر بولے: "جناب آپ ہی کے گاؤں میں پلیگ آیا ہے، چلوں میں بھی قلعی کھولوں؟"

شرما جی نے کچھ نہ جواب دیا۔ بہلی پر بیٹھے بے گاری حاضر تھے۔ اُنہوں نے اسباب سر پر لادا۔ چیت کا مہینہ تھا۔ آم کی بور کی خوشبو سے لدی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئل کی سہانی کوک سُنائی دے جاتی تھی۔ کھلیانوں میں کسان خوشی سے مست ہو کر گا رہے تھے۔ پر شرما جی اپنی خفت سے اس درجہ مکدّر ہو رہے تھے، کہ انہیں ان دلفریبیوں کا احساس ہی نہیں ہوا۔

گاؤں بہت دور نہ تھا۔ شرما جی کے والد مرحوم خوش مذاق آدمی تھے۔ ایک چھوٹا سا باغ، مختصر سا بنگلہ، پختہ کنواں، شیو جی کا مندر انہیں کی یادگاریں تھیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پر شرما جی کو اس موضع میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ بنگلہ میں آسائش کے سامان موجود تھے۔ بہلی سے اُترے تو سنیکڑوں کو دروازے پر کھڑا پایا۔ پر شرما جی تھکے ہوئے تھے، کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔

دو گھڑی رات جاتے جاتے شرما جی کے نوکر چاکر بھی ٹم ٹم لیے آ

پہنچے۔ کہار، سائیس اور مہراج تینوں نے اس شان سے اسامیوں کو دیکھا گویا وہ سب اُن کے غلام ہیں۔ سائیس نے ایک موٹے تازے کسان سے کہا، "گھوڑے کو کھول دو۔"

غریب کسان ڈرتے ڈرتے گھوڑے کے قریب گیا۔ گھوڑے نے اجنبی صورت دیکھی۔ تیور بدلے۔ کنوتیاں کھڑی کیں۔ کسان ڈر کر لوٹ آیا۔ تب سائیس نے اسے دھکا دے کر کہا، "بس تجھیا کے تاؤ ہی ہو۔ ہل جوتنے سے کیا اکل بھی چلی جاتی ہے؟ یہ لو گھوڑے کو ٹہلا دو۔ منہ کیا بناتا ہے کیا کوئی سنگھ ہے جو کھا جائیگا۔" کسان نے ڈرتے ڈرتے راس پکڑی۔ غریب کی سہمی ہوئی صورت دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ قدم قدم پر خائف نگاہوں سے گھوڑے کی طرف دیکھتا اور اس طرح ڈرتا تھا۔ گویا پولیس کا سپاہی ہے۔

رسوئی بنانے والے مہراج نے فرمایا، "ارے نائی کہاں ہے۔ چل پانی وانی لا۔ ذرا پیر دبا دے تھک گیا ہوں۔"

مختار صاحب ان مہمانوں کی ضیافت کا انتظام کرنے لگے۔ سائیس اور کہار کیلئے پوریاں پکوائیں۔ مہراج کیلئے بوٹی بھنگ مہیا کی۔ اشارے پر دوڑتے تھے۔ اور کسانوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو بن داموں کے غلام تھے۔ اور آزاد محنت کی کمائی کھانے والے کسان اس وقت غلاموں کے غلام بنے ہوئے تھے۔

(۵)

کئی دن گزر گئے۔ شرما جی اپنے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے اخبار اور کتابیں

پڑھا کرتے۔ ہالینڈ کی زراعت۔ امریکہ کی صنعت۔ جرمنی کی تعلیم کے اعداد اور نقشے ان کے پیشِ نظر رہتے۔ گاؤں میں ایسا کون تھا۔ جس سے وہ حظِ صحبت حاصل کر سکتے؟ بے شک کسانوں سے بات چیت کرنے کا انہیں شوق تھا۔ مگر یہ اُجڈ۔ اکھڑ۔ کسان نہ معلوم کیوں اُن سے محترز رہتے۔ شرما جی کا دماغ نادر معلومات کا ذخیرہ تھا۔ وہ کسانوں کو اپنے اس ذخیرہ سے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ گنوار اُن سے ملتفت ہی نہ ہوتے۔ وہ انہیں جھک کر سلام ضرور کرتے اور تب کترا کر نکل جاتے۔ جیسے کوئی پاگل کتے سے بچ کر نکل جائے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ کہ شرما جی کے ان سے ہمکلام ہونے کی خواہش کا کیا راز تھا۔ خالص ہمدردی یا اپنی بڑائی کا اظہار!

شرما جی کی ڈاک شہر لاہور سے لانے اور لیجانے کیلئے دو آدمی روزانہ روانہ کئے جاتے۔ وہ "لونی کونے" کے طرزِ علاج کے قائل تھے۔ سبزی اور میوے زیادہ استعمال کرتے۔ ایک آدمی بھی اس کام کے لئے بھی دوڑایا جاتا۔ شرما جی نے اپنے مختار کو سخت تاکید کر دی تھی۔ کہ کسی سے مفت کام نہ لیا جائے۔ بلکہ مناسب مزدوری دی جایا کرے۔ پھر باوجود اس کے انہیں تعجب ہوتا تھا۔ کہ کوئی آدمی خوشی سے ان کاموں کیلئے آمادہ نہ ہوتا۔ روز باری باری سے اسامی بھیجے جاتے۔ وہ اسے بھی ایک قسم کی بیگار سمجھتے۔ مختار صاحب کو اکثر سختی سے کام لینا پڑتا۔ شرما جی کاشتکاروں کے اس تامل اور تساہل کو منھ مروڑی اور کج خلقی کے سوا اور کسی خیال سے منسوب

نہ کر سکتے۔ کبھی کبھی خود بھی گنوار کے بادلوں کی طرح اپنے گوشۂ عافیت سے نکل ان پر برس پڑتے۔ گھوڑے کیلئے چارہ کا انتظام بھی تردد سے خالی نہ تھا۔ روز شام کے وقت جبر وتشدد کی بانگ بلند کے ساتھ بین ولبکا کی دبی ہوئی سسکیاں اُن کے کان میں آتیں۔ ایک کہرام سا مچ جاتا۔ لیکن اس معاملہ میں بھی وہ اپنے تئیں معذور سمجھتے۔ گھوڑا ابھو کوں نہیں مر سکتا۔ گھاس کے دام دیئے جاتے ہیں۔ اس پر بھی اگر واویلا مچتا ہے۔ تو مچے۔ اس کی دوا میرے پاس نہیں۔ اُن کے دل میں یہ کم از کم پختہ ہوتا جاتا تھا۔ کہ دیہاتی بڑے سرکش جبر پسند اور مٹھ مرد ہیں۔ مختار عام صاحب ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں۔ اس میں مو فرق نہیں ہے۔ اخباروں اور تقریروں میں فضول اس قدر شور وشر مچایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس سے زیادہ ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اور جو لوگ ان کی بیکسی اور پستی کا راگ الاپتے ہیں۔ وہ حقیقت حال سے بیخبر ہیں۔

ایک روز شرما جی بیٹھے بیٹھے اکتا کر سیر کرنے نکلے۔ اور گھومتے گھامتے کھلیان کی طرف نکل گئے۔ آموں کے جھرمٹ میں کسانوں کی گاڑھی محنت کے سنہرے انبار لگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف بھس کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ حلقۂ ماہ کی طرح زمین پر جو اور گیہوں کے ڈنٹھلوں کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ بیلوں کے منہ میں جالی نہ تھی۔ وہ جب چاہتے تھے۔ بھوسہ میں منہ ڈال کر اناج کا ایک گال کھا لیتے تھے۔ یہ سب انہیں کے پسینے کی کمائی ہے۔ آج اُن کے منہ میں جالی دنیا ناشکری ہے۔ جا بجا اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کا دھوبی۔ چمار۔ بڑھئی اور کمہار صورت امید کھڑے تھے۔ ایک طرف نٹ ڈھول بجا بجا کر کرتب دکھا رہا تھا۔ بھاٹ

کی طبیع موزوں آج مدِّ اکبر پر تھی۔ شرما جی اس نظارہ سے بہت خوش ہوئے۔ مگر اس ہنگامۂ مسرت میں اُن کی نگاہ اپنے کئی سپاہیوں پر پڑی۔ جو لٹھ لیے اناج کے ڈھیروں کے پاس بیٹھے تھے۔ سہانے سبزہ زار میں ٹھنٹھ جتنا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ نغمۂ دلپذیر میں بے سُری آواز جس طرح کانوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ اُسی طرح شرما جی کی پُر ذوق نگاہوں میں یہ منڈلاتے ہوئے سپاہی نظر آئے۔ اُنہوں نے قریب جا کر ایک سپاہی کو بلایا۔ سب کے سب پگڑیاں سنبھالتے دوڑتے ہوئے آ کر کھڑے ہو گئے۔ شرما جی نے پوچھا۔ "تم لوگ یہاں اسطرح کیوں بیٹھے ہو؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ سرکار ہم لوگ اسامیوں کے سر پر سوار نہ رہیں تو ایک کوڑی لگان نہ وصول ہو۔" دوسرے نے کہا۔ اناج گھر میں جانے کی دیر ہے۔ پھر تو یہ سیدھے مُنہ بات بھی نہ کریں گے۔ بڑے سرکش لوگ ہیں۔ ہم لوگ رات کو یہیں رہتے ہیں۔ اتنے پر بھی جہاں آنکھ جھپکی، ڈھیر غائب ہوا۔"

شرما جی:۔ "آخر تم لوگ یہاں کب تک رہو گے؟"

سپاہی:۔ "جب تک سرکاری جمع کوڑی وصول نہ ہو جائیگی۔ ہم لوگ بنئے کو بلا کر اپنے سامنے اناج تلواتے ہیں۔ جو کچھ ملتا ہے۔ اس میں سے سرکاری رقم کاٹ کر اسامی کو دے دیتے ہیں۔"

شرما جی نے سوچا۔ جب یہ کیفیت ہے۔ تو ان کسانوں کی حالت کیوں نہ خراب ہو۔ غریب اپنے دھن کے مالک خود نہیں ہیں۔ یہ اُسے اپنے پاس رکھ کر زیادہ بہتر موقع پر نہیں بیچ سکتے۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ بالفرض میں اسوقت ان کے ساتھ رعائیت کر دوں۔ لیکن لگان نہ وصول ہوا تو؟ کاش

ہالینڈ کی مشترکہ زرعتی سوسائٹیاں یہاں ہوتیں! شرما جی کے دل میں کسانوں کی مٹھ مردی کا جو خیال پیدا ہو چلا تھا۔ اس میں اس نظارہ نے کچھ خفیف سی ترمیم کر دی، اس مسئلہ کو سوچتے ہوئے وہ یہاں سے چل دیئے۔ سپاہیوں نے ساتھ چلنا چاہا۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ جلوس سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ اکیلے گاؤں میں گھومنے لگے۔ گاؤں کیا تھا۔ ملیریا اور غلاظت کا مرکز تھا۔ انافلیز کی رقص گاہ، کیولکس کی عملداری اور "اسٹگویاما" کا میدان قتال! کہیں گوبر کے ڈھیر۔ کہیں کوڑے کا انبار۔ ہوا میں عفونت۔ مکانات اکثر بوسیدہ۔ دیواریں چھپر کے بوجھ سے زمین میں دھنسی ہوتی پرنالوں کا پانی چاروں طرف بہتا ہوا۔ شرما جی نے ناک بند کر لی اور تیزی سے قدم بڑھانے لگے۔ دم گھٹنے لگا۔ تو دوڑے خوب زور سے دوڑے اور ہانپتے ہوئے ایک سایہ دار نیم کے درخت کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ابھی اچھی طرح سانس بھی نہ لینے پائے تھے۔ کہ بابو لال نے آ کر پالاگن کیا۔ اور پوچھا "کوئی سنڈاس وِنڈاس تھا کیا؟"

اس موضع میں بابو لال بھی آدھ آنے کے حصہ دار تھے۔ تعطیلوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پلیگ کی وجہ سے کچہری بند ہو گئی تھی۔ اس لئے چلے آئے تھے۔

شرما جی بولے۔ "سنڈاس سے بھی زیادہ ہولناک گندی ہوا تھی۔ اُف یہ لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں؟"

بابو لال :۔ رہتے کیا ہیں۔ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔"
شرما جی :۔ مگر یہ مقام تو صاف نظر آتا ہے؟

بابو لال :- "جی ہاں اس طرف گاؤں کے کنارے تک صاف جگہ ملیگی۔"

شرما جی :- "تو پھر اس طرف کیوں اتنی گندگی ہے؟"

بابو لال :- "گستاخی معاف ہو تو عرض کروں۔"

شرما جی :- "(ہنس کر) جان بخشی کیوں نہ کروائی۔ واقعی کیا بات ہے؟ ایک طرف ایسی صفائی دوسری طرف ایسی غلاظت۔"

بابو لال :- "یہ میرا حصہ ہے۔ میں اپنے حصہ کی نگرانی خود کرتا ہوں۔ آپ کا حصہ ملازموں کی توجہ پر ہے۔"

شرما جی :- "اچھا! یہ بات ہے! آخر آپ کیا حکمت کرتے ہیں؟"

بابو لال :- "کچھ نہیں صرف تاکید کرتا رہتا ہوں۔ جہاں زیادہ گندہ پن دیکھتا ہوں۔ خود صاف کروا دیتا ہوں۔ صفائی کا ایک انعام مقرر کر دیا ہے۔ جس کا مکان سب سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔ اس کو یہ انعام ملتا ہے۔ آیئے تشریف رکھیے۔"

شرما جی کیلئے ایک کرسی رکھ دیگئی۔ آکر بیٹھ گئے۔ اور بولے "شاید آج ہی آتے ہو؟"

بابو لال :- "جی ہاں۔ پلیگ نے کچہریوں پر بھی اثر کیا۔"

شرما جی :- "شہر کی کیا کیفیت ہے؟"

بابو لال :- بہت خراب۔ بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ سوشل سروس والے آپکے آتے ہی غائب ہو گئے۔ غریبوں کے گھروں میں لاشیں پڑی سڑتی ہیں۔ میونسپلٹی والے بھی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ بازار بند ہیں۔ اناج مشکل سے

ملتا ہے"۔

شرما جی:۔ "بھلا بتایئے ایسی حالت میں وہاں رہکر کیا کرتا۔ لیس لوگوں نے میری ہی جان سستی سمجھ رکھی ہے۔ کیا مجھی کو قومی خدمت کا دعوے ہے۔ جسے دیکھو وہی قومی شہید بنا پھرتا ہے۔ جو لوگ ہزاروں روپے عیش اور تکلف میں اُڑاتے ہیں۔ اُن کا شمار بھی قومی فدائیوں میں ہے۔ میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہوں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کوئی دیوتا نہیں۔ فرشتہ نہیں۔ دولت کی ہوس نہ سہی۔ مگر قومی اعزاز کی ہوس مجھے بھی ہے۔ میں جو شب وروز اخبار بینی میں صرف کردوں۔ اخباروں کیلئے مضامین لکھنے میں سر کھپاؤں۔ جا بجا تقریریں کرتا پھروں۔ اس کا صلہ بس یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ جب کسی سیٹھ جی یا وکیل صاحب کے در دولت پر حاضر ہو جاؤں تو وہ ایک مربیانہ انداز سے میری مزاج پرسی کرلیں۔ لیکن جب کوئی ممبری خالی ہوتی ہے۔ تو نظر انتخاب فوراً کسی وکیل پر جا پڑتی ہے۔ جنہیں بجز اپنی ذاتی ثروت کے اس اعزاز کا کوئی استحقاق نہیں۔ تو بھئی جو گڑ کھائے وہی کان چھدائے۔ قومی سرفروشی کا بہترین صلہ قومی اعزاز ہے۔ جب وہاں تک میری رسائی ہی نہیں۔ تو کیوں جان دوں۔ اگر یہ آٹھ سال میں نے لکشمی کی پوجا میں صرف کئے ہوتے۔ تو غالباً اب تک میرا شمار بھی لیڈروں میں ہوتا۔ میں ابھی تک چھٹ بھیوں میں سمجھا جاتا ہوں۔ جہاں دیکھو وہاں دولت کی پوچھ اور قدر ہے۔ ابھی میں نے کتنی محنت سے زراعتی بنک پر مضمون لکھا۔ مہینوں اس کی تیاری میں صرف کئے۔ سینکڑوں میگزین اور رسالے پڑھنا پڑے۔ مگر کسی نے اس مضمون کو پڑھنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں

کی۔ اگر اتنی محنت کسی اور کام میں صرف کرتا تو کم سے کم اپنا بھلا تو ہوتا۔ نہیں تو جھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا کرنے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوا؟"

بابولال:۔ "آپ کا فرمانا بجا ہے۔ مگر جب آپ جیسے لوگ ایسے خیالات کو دل میں جگہ دینگے تو یہ قوم کا بیڑہ کون پار لگائے گا؟"

شرماجی:۔ "وہی جو آنریبل بنے گھومتے ہیں۔ بندہ تو اب سیر و سیاحت کریگا۔ دنیا کی ہوا کھائے گا۔ بابولال نے سلسلۂ کلام بدل کر پوچھا "یہ تو بتلائیے دیہات کو آپ نے پسند کیا؟"

شرماجی:۔ "پسند تو خاک نہیں کیا۔ ہاں کچھ نئے تجربے البتہ ہو گئے۔ خیال تھا، کہ کاشتکار لوگ بڑے غریب اور بے کس ہوتے ہیں۔ اب معلوم ہوا۔ کہ یہ لوگ موٹے ڈنا مہمان نواز اور جبر پسند ہیں۔ سیدھے سے بات نہ سنیں گے۔ مگر سختی سے جو کام چاہو کرا لو۔ بس چوپایوں کا خاصہ ہے۔ اور تو اور مالگذاری کیلئے بھی ان کے سر پر سوار رہنے کی ضرورت ہے۔ ٹل جاؤ تو کوڑی نہ وصول ہو۔ نالش کیجئے، قرقی کرائیے، بیدخلی جاری کیجئے، خود زیر بار ہو کر انہیں زیر بار کیجئے۔ یہ سب انہیں منظور ہے۔ پر وقت پر روپیہ دینا نہیں جانتے۔ یہ سب تجربے میرے لئے نئے ہیں۔ مجھے اب تک ان سے جو ہمدردی تھی۔ وہ اب نہیں ہے۔ اخباروں میں ان کے حال زار پر جو مرثیئے پڑھے جا رہے ہیں۔ وہ بالکل خیالی اور فرضی ہیں۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

بابولال:۔ "مجھے تو اب تک اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میرا تجربہ تو یہ ہے۔ کہ یہ لوگ بڑے خلیق، احسان شناس اور با مروت ہیں۔ ہاں ان کے اوصاف

سطح پر نہیں نظر آتے۔ اُن سے ہمدردی کیجئے۔ ملیئے۔ اُن کے دل میں گھسیئے۔ تب ہم کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان پہ اعتبار کیجئے۔ تب وہ آپ پہ اعتبار کریں گے۔ آپ کہیں گے پیش قدمی ان کا کام ہے۔ اور آپ کا کہنا درست ہے۔ پر صدیوں سے انہوں نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کہ ان میں آزادانہ اوصاف سلب ہو گئے ہیں۔ زمیندار کو وہ ایک ہوّا سمجھتے ہیں۔ جس کا کام انہیں نگل جانا ہے۔ چونکہ وہ اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ مکروفریب سے کام لیتے ہیں۔ جو کمزوریوں کی سپر ہے۔ لیکن ایکبار آپ اُن کی نگاہ میں اپنا اعتبار جما دیتے ہیں۔ تو پھر آپ کو شکایت کا کوئی موقعہ نہ رہے گا۔"

بابو لال یہ باتیں کہہ ہی رہے تھے کہ چماروں نے گھاس کے گٹھے لا کر اُن کے دروازہ پر ڈال دیئے۔ اور چپ چاپ چلے گئے۔ شرما جی کو تعجب ہوا۔ اسی گھاس کیلئے اُن کے بنگلہ پر روز ہائے وائے مچتی ہے۔ اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پوچھا۔ "آخر اعتبار جمانے کی ترکیب بھی کوئی ہے؟"

بابو لال نے منکسرانہ انداز سے کہا۔ "آپ خود عاقل اور زمانہ شناس ہیں۔ میرا آپ کے رُوبرو زبان کھولنا گستاخی ہے۔ میں تو اس کی ایک ہی ترکیب جانتا ہوں۔ انہیں کسی تکلیف میں دیکھ کر فوراً ان کی مدد کیجئے۔ میں نے انہیں کیلئے ہومیوپیتھی سیکھی اور ایک چھوٹا سا شفاخانہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اگر کبھی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو روپیہ، اناج کی ضرورت ہوتی ہے تو اناج دیتا ہوں۔ پر سود نہیں لیتا۔ اس میں مجھے خسارہ ہرگز نہیں ہوتا۔ دوسری صورتوں میں سود سے بہت زیادہ مل رہتا ہے۔ گاؤں میں دو اندھی عورتیں اور دو یتیم لڑکیاں ہیں۔ ان کی پرورش کا انتظام کر دیا

ہے۔ ہوتا سب کسانوں کی ہی کمائی سے ہے۔ پر نیک نامی میری ہوتی ہے۔ اتنے میں کئی اسامی آ گئے۔ اور بابو لال سے بولے۔ "بھیّا! باقی لے لی جائے۔"

بابو لال نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ روپیہ رکھ کر چل دیئے۔ شرما جی نے سوچا۔ ابھی لگان کیلئے میرے چپراسی کھلیان میں چار پائیاں ڈال کر سوتے ہیں۔ اور وہی لگان یہاں اس طرح بے خوش وصول ہو رہا ہے۔ بولے "یہ تو اسی حالت میں ہو سکتا ہے۔ جب زمیندار خود گاؤں میں رہے۔"

بابو لال "جی ہاں اور کیا۔ اور محض رہنے ہی سے کیا ہوگا۔ اس کی نیت صاف ہو۔ طبیعت میں ہمدردی کا مادہ ہو۔ حریص، خود غرض، ظالم نہ ہو۔ ورنہ اس کا گاؤں سے دور رہنا ہی اچھا۔ ہاں بڑے بڑے زمینداروں کو البتہ یہ دقت ہوتی ہے۔ کہ بعض اوقات وہ نیت صاف رکھنے پر بھی اپنی اسامیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اُن کے ملازم کچھ کا کچھ کیا کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اگر آقا کسی کام کو دل سے کرنا چاہے۔ تو اس کے ملازم جلد یا دیر میں ضرور اس کی راہ پر چلنے لگتے ہیں۔ ہاں اگر آقا میں خود ہی کمزوری باقی ہے۔ نیت کا صاف ہے۔ لیکن ارادہ کی قوت اور فیصلہ کی ہمت نہیں رکھتا تو ملازمین کی بن آتی ہے۔ وہ اسے اپنے ڈھرّے پر کھینچ لے جاتے ہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شرما جی کے کہار نے آ کر اطلاع دی کہ رسوئی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چل کر جیم لیجئے۔

(۶)

شرما جی یہاں سے اُٹھے۔ تو بابو لال کی باتیں ان کے کانوں میں گونج رہی

تھیں۔ ان کے معقول ہونے میں شک نہ تھا، لیکن شرما جی اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اور کسی بات کو خواہ وہ بظاہر کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو، بغیر استدلال اور توجیہ کے تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ بابو لال کو وہ ہمیشہ ایک معمولی عقل کا انسان سمجھتے آئے تھے۔ اور اس خیال میں یکبارگی تغیر ہونا ناممکن تھا۔ ان باتوں کا اُلٹا اثر یہ ہُوا۔ کہ انہیں بابو لال سے کچھ چڑھ سی ہو گئی۔ انہیں ایسا معلوم ہوا گویا وہ زمینداری کے معاملات میں اپنی فضیلت کا اظہار کرتا ہے۔ جس شخص نے ہمیشہ دوسروں کو تعلیم و تنبیہہ کی ہو۔ وُہ بابو لال جیسے آدمی کا معتقد کیونکر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے بنگلہ کو لوٹنے لگے۔ تو ان کا استدلال بابو لال کی باتوں کے پُرزے پُرزے کر رہا تھا۔ "خوب! اب میں دیہات میں آکر رہُوں۔ ساری زندگی کی آرزوؤں سے ہاتھ دھولوں۔ دہقانوں کے ساتھ گپیں اُڑاؤں۔ گھڑی آدھ گھڑی تو خیر دل بہلاؤ کے طور پر اُن سے بات چیت کرنا ممکن ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ دس پانچ گنوار میرے سر پر سوار رہیں۔ مجھے تو مالیخولیا ہو جائیگا۔ مانا کہ میرا فرض ان کی خبر گیری ہے۔ پر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اُن کے لئے میں اپنے تئیں بدل ڈالوں۔ بابو لال بننا اب میرے امکان سے باہر ہے۔ جس کی پرواز فکر اس گاؤں کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتی۔ مجھے دنیا میں بہت کام کرنا ہے۔ میرے لئے یہ زندگی ناموزوں ہی نہیں۔ بلکہ مہلک ہے۔"

یہی سوچتے ہوئے وہ بنگلہ پر پہنچے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ کئی کانسٹیبل مغرورانہ انداز سے برآمدہ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ مختار عام نے شرما جی کو دیکھتے ہی بڑھ کر کہا۔ "حضور! آج داروغہ جی آ گئے ہیں۔ میں نے کمرہ میں ان کے پلنگ

بچھوا دیئے ہیں۔ یہ لوگ جب اس علاقہ میں آجاتے ہیں۔ تو یہیں قیام کرتے ہیں۔ حضور کا پلنگ اُوپر بچھا ہوا ہے"

شرما جی اپنے دوسرے اخبار نویسوں کی طرح پولیس سے بُغض للّٰہ رکھتے تھے۔ یہ باتیں سنتے ہی اُن کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ خشمگیں نگاہوں سے مختار صاحب کی طرف دیکھا۔ اور دل میں یہ ٹھان کر کہ ابھی ان حضرات کا بوریا بستر اُٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں۔ تیور بدلے۔ جھپٹتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ کہ چھوٹے داروغہ ٹھاکر کوکلت سنگھ نے کمرے سے نکل کر پالاگن کیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولے۔ "اچھی ساعت سے چلا تھا۔ کہ آپ سے نیاز ہو گیا۔ آپ مجھے بھول تو نہ گئے ہوں گے۔"

یہ حضرت دو سال قبل سوشل سروس لیگ کے ایک سرگرم ممبر تھے انٹرمیڈیٹ کلاس میں فیل ہو جانے کے بعد پولیس ٹریننگ میں داخل ہو گئے تھے۔ شرما جی نے انہیں دیکھا۔ پہچان گئے۔ ہاتھ بڑھا دیا۔ غصّہ فرو ہو گیا مسکرانے کی کوشش کر کے بولے۔ "حافظہ تو ذی اختیار لوگوں کا کمزور ہوتا ہے۔ میں آپ کو دور ہی سے پہچان گیا۔ کہئے کیا اسی تھانے میں تعینات ہوئے ہیں؟"

کوکلت سنگھ۔ "جی ہاں۔ آج کل یہیں ہوں۔ آیئے آپ کو داروغہ جی سے انٹروڈیوس کرا دوں۔"

اندر کرسی پر داروغہ ذوالفقار خاں لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ قوی ہیکل آدمی تھے۔ چہرہ سے رُعب اور تحکم نمایاں تھا۔ شرما جی کو دیکھتے ہی اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ اور بولے۔ "آپ سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق مدت سے تھا۔ آج

خوش نصیبی سے موقعہ بھی مل گیا۔ اس تصرف بیجا کو معاف فرمائیے گا۔"

شرماجی کو تجربہ ہوا۔ کہ پولیس کے لوگ خواہ مخواہ کج خلق مشہور ہیں۔ ہاتھ ملا کر بولے۔ "یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ آپ کا خانہ بے تکلف ہے۔"

لیکن پولیس پر چھینٹے جمانے کا ایسا نادر موقعہ ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے تھے۔ یکلخت تنگ ہو کر بولے۔ "آپ نے تو شاید پچھلے سال کالج چھوڑا۔ لیکن پولیس میں کیونکر آپھنسے؟"

داروغہ ذوالفقار خاں یہ للکار سن کر سنبھل بیٹھے۔ اور بولے۔ "کیوں جناب! کیا پولیس ہی سارے محکموں سے گیا گزرا ہے۔ ایسا کون سا محکمہ ہے۔ جہاں رشوت کا بازار گرم نہیں؟ اگر آپ کسی ایسے محکمے کا نام بتا دیجئے۔ تو تا زیست غلامی کروں۔ ملازمت کر کے کوئی رشوت سے بچ جائے۔ یہ محال ہے۔ تعلیم کے محکمہ کو بے لوث کہا جاتا ہے۔ مگر اس کا بھی تجربہ ہو گیا۔ ایڈیٹر لوگ بڑے پاک و صاف بنتے ہیں۔ مگر اُن کی بھی تھاہ لے چکا۔ شفاخانہ کا محکمہ پاک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں حلف اُٹھا سکتا ہوں۔ کہ پولیس سے وہ کسی معنی میں بہتر نہیں۔ اب میں کسی کی راستبازی کے دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور دوسرے محکموں کی نسبت کو کچھ نہیں کہتا۔ لیکن پولیس کے محکمہ میں جو رشوت نہیں لیتا۔ اُسے میں احمق سمجھتا ہوں۔ میں نے دو ایک راستبازوں کو سب انسپکٹر بنتے دیکھے ہیں۔ لیکن ہمیشہ تباہ۔ کبھی معتوب۔ کبھی معطل۔ کبھی برخاست۔ وہ شخص خود نہ کھائے گا۔ وہ دوسروں کو کیوں کھانے دیگا۔ لیکن چوکیدار اور کانسٹیبل ہمارے دست و بازو ہیں۔ انہیں کی کارگزاری اور جانفشانی پر ہماری نیکنامی کا دارومدار ہے۔

جب وہ خود پریشان حال ہوں گے۔ تو کام کیا خاک کرینگے۔ جو لوگ خود ہاتھ بڑھا کر لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ اور افسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ ان کا شمار، کارگزار اور نیکنام افسروں میں ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنا یہی اصول مقرر کر لیا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے۔ افسر اور ماتحت سبھی خوش ہیں"

شرما جی نے کہا کہ اِنہیں وجوہ سے تو میں نے ٹھاکر صاحب سے کہا۔ کہ آپ یہاں کیونکر آ پھنسے۔

ذوالفقار خاں تیز ہو کر بولے "پھنسے نہیں۔ یہاں آ کر پارس ہو گئے ورنہ کسی دوسرے صیغہ میں ہوتے۔ تو ابتک ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اب گھوڑے پر سوار نوشہ بنے گھومتے ہیں۔ ہاں ذرا ابھی تنہا خوری کی عادت ہے وہ رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ بھئی ٹھاکر صاحب برا نہ مانئے گا۔ میں نے کئی نئے ٹریننگ والوں کو دیکھا۔ یہ حضرت چاہتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہے۔ اکیلے ہی ہضم کر لیں تھانہ کے دیگر اہلکار منہ تاکتے رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی نگاہ میں ایماندار بننا چاہتے ہیں۔ ایماندار بنتے ہو تو دل سے بنو۔ اس مکاری سے کیا حاصل ہے جب خدا ہی کا خوف نہیں۔ تو دنیا کا کیا ڈر؟ یہ حضرات چھوٹی چھوٹی رقموں پر گرتے ہیں۔ مارے غرور کے کبھی دیرینہ آدمی سے تجربہ نہ حاصل کرینگے۔ جہاں آسانی سے سو ملتے ہیں۔ وہاں پانچ میں ٹیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں دودھ والے کی قیمت مار لی۔ کہیں مودیوں کے نرخ کے بارے میں دردسری کی۔ کہیں حجام کے پیسے دبا لئے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے فائدہ تو بہت کم ہوتا ہے۔ بدنامی البتہ بہت۔ میں بڑے بڑے شکاروں پر نگاہ رکھتا ہوں۔ پہلی ادلہ

بٹیر ماتحتوں کیلئے چھوڑ دیتا ہوں ۔ اور حق تو یہ ہے۔ غرض بُری شے ہے۔ رشوت دینے والوں سے زیادہ احمق اور اندھے آدمی دنیا میں نہ ہوں گے۔ کتنے ہی ایسے باؤلے آتے ہیں۔ جو محض یہ چاہتے ہیں۔ کہ میں اُن کے کسی پٹی دار یا رقیب کو دو چار جھڑپ سنا دوں۔ اتنے ہی کیلئے سینکڑوں روپے دیئے جاتے ہیں۔ ایسے عقل کے دشمنوں پر رحم کرنا حماقت ہے۔ اس علاقہ کو ضلع میں کان جواہر کا خطاب ملا ہوا ہے۔ سب انسپکٹر لوگ اس کے عاشق ہیں۔ ایک نہ ایک فساد روز برپا ہوتا رہتا ہے۔ زمیندار بڑے جاہل لٹھ باز، ذرا ذرا سی بات پر فوجداریاں کر بیٹھتے ہیں رئیس سارے علاقہ میں یہی آپ کا پٹی دار بابو لال اللہ سمجھدار آدمی ہے۔ اس کے یہاں کسی کی دال نہیں گلتی۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ کوئی اس سے ناخوش نہیں۔ بس میٹھی میٹھی قند و شکر کی سی باتوں سے من بھر دیتا ہے۔ اپنی اسامیوں کیلئے جان دینے کو حاضر اور حق تو یہ ہے کہ میں زمیندار ہوتا۔ تو اسی کے نقش قدم پر چلتا۔ زمیندار کا فرض ہے کہ اپنی آسامیوں کو ظلم و ستم سے بچائے۔ ان پر شکاریوں کا وار نہ ہونے دے۔ کیوں حرص یا ضرورت سے مجبور ہو کر انسان کیا نہیں کر ڈالتا۔ لیکن ان غریب، بے کسوں کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ اور ان کیلئے جو شخص سینہ سپر ہو۔ اُس کو داد دینی چاہیئے"

شرما جی نے داروغہ صاحب کی اس طولانی تقریر کو اس طرح سُنا۔ گویا وہ کسی مجذوب کی بکواس ہے۔ ظالمانہ صاف گوئی اور ستم ظریفانہ انداز اور تیق انسانیت کے ساتھ برہنہ خود غرضی نے اس میں ایک خاص لطافت پیدا کر دی تھی۔ ایسی تقریر کا جواب دینے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ بولے "کیا کوئی تفتیش

درپیش ہے یا محض گشت ؟"

داروغہ جی نے فرمایا "جی نہیں مسٹر گشت کہاں آجکل فصل کے دن ہیں اور یہی زمانہ ہماری فصل کا بھی ہے۔ شیر کبھی تو ماند میں بیٹھے بیٹھے شکار نہیں ملتا۔ ہم بھی شکار کی تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ خفیہ فروش گو گرفتار کریں گے۔ کسی کو سرقہ کا مال خریدتے ہوئے پکڑیں گے۔ اور اگر ہمارے نصیب سے کہیں ڈاکہ پڑ گیا۔ تو پانچوں گھی میں ہیں۔ علاقہ میں جتنے شری فتنہ باز سیاہ قلب دو پائے ہیں۔ وہ سب اپنے تابع فرمان ہیں۔ آپ میری صاف گوئی پر حیران ہوتے ہوں گے۔ لیکن میں اپنے سارے ہتھکنڈے بیان کروں تو شاید آپکو یقین نہ آئے۔ اور لطف یہ ہے کہ میرا شمار ضلع کے نہائت ہوشیار۔ متدین۔ کارگزار سب انسپکٹروں میں ہے۔ فرضی مجرم بھی بکھیر تا ہوں۔ مگر سزا انہیں اصلی کو دلواتا ہوں۔ میری فراہم کی ہوئی شہادتیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ بیرسٹر کا باپ بھی ہو۔ تو ناکوں چنے چبائے۔"

اس اثنا میں شہر سے ڈاک آگئی۔ شرما جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے۔ "داروغہ جی آپ کی باتیں بڑی مزیدار ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔"

(۷)

چاندنی رات تھی۔ شرما جی کھلی چھت پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھنے میں غرق تھے۔ اخبار ان کے لئے دعوتِ رُوح تھی۔ اس میں انہیں نغمہ اور بہار کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ دفعتاً ایک ہلچل سُن کر نیچے جھانکا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں کے ہر ایک طرف سے کسانوں کے غول کانسٹیبلوں کیساتھ

چلے آرہے ہیں۔ رہ رہ کر کانسٹیبلوں کی گالی گلوج بھی سُنائی دیتی تھی۔ یہ سب آدمی بنگلہ کے سامنے صحن میں بٹھائے جاتے تھے۔ کہیں کہیں سے عورتیں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی پُر زور آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ شرما جی حیران تھے۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ دفعتہً بڑے داروغہ صاحب کی گرج سُنائی دی۔ "تم لوگوں کو تھانہ میں چلنا ہوگا۔ ہم ایک نہ مانیں گے۔"

پھر سناٹا ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسانوں میں کانا پھوسی ہو رہی ہے۔

اس کے بعد ایک کہرام سا مچ گیا۔ مختار صاحب اور داروغہ جی کی مغلظات اس گریہ و زاری میں یوں سُنائی دیتی تھی۔ جیسے آندھی میں بادل کی گرج۔

شرما جی سے اب صبر نہ ہوسکا۔ وہ زینہ کے دروازے پر آئے۔ اور کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ میز پر روپے گنے جارہے تھے۔

"داروغہ صاحب بولے۔" اتنے بڑے موضع میں یہ رقم؟"

مختار صاحب نے جواب دیا۔ "گھبرائیے نہیں۔ اب کے مکھیوں کی خبر لی جائے۔"

تب داروغہ جی نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ حرامزادے سیدھے سے نہ مانیں گے۔ اٹل سنگھ! ان مکھیوں کو گرفتار کرلو۔ فوراً ہتھکڑیاں ڈال دو۔ ایک ایک کو جیل بھجوا دوں گا۔ یہ ڈاکہ انہیں لوگوں کا کام ہے۔ دیکھوں کیسے بچتے ہیں۔"

پھر صحن میں ڈھول سی پیٹنے لگی۔ شرما جی کا خون جوش کھا رہا تھا۔ اُنہوں نے ہمیشہ حق اور انصاف کی حمایت کی تھی۔ ظلم و ستم کا یہ ڈرامہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خاموش رہنا ان کیلئے غیر ممکن تھا۔

یکایک کسی نے چیخ کر کہا۔ "دوہائی ہے سرکار کی۔ مختار صاحب ہم

کا ہک ناہک ہر وائے ڈالتے ہیں!"

اس فریاد نے بارود میں آگ لگا دی۔ شرما جی غصہ سے بھرے ہوئے بے تحاشہ زینہ سے اُترے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جاتے ہی مختار صاحب کو ٹھڈوں سے گرا دیں گے۔ اور داروغہ کو ایسی لعن طعن کریں گے۔ کہ اسے بھاگتے ہی بن پڑے۔ مگر پبلک ہمدردوں میں ضبط نفس کی بڑی طاقت ہے۔ سنبھل گئے۔ تو ازن غصہ پر غالب آ گیا۔ مختار صاحب کو بلا کر کہا۔ "لالہ صاحب آپ نے یہ کیا غل غپاڑہ مچا رکھا ہے؟"

مختار صاحب بولے۔ "حضور داروغہ جی نے ان آدمیوں کو ایکا اکہ کی تفتیش کیلئے طلب کیا ہے۔" اور شرما جی کے کان میں کہا۔ "آدھا سا جھا طے ہو گیا ہے"۔ شرما جی کو اب تاب نہ رہی تلملا کر بولے۔ "تم حرامخور ہو خبردار جو مجھ سے ایسی بات کی۔ ان آدمیوں کو فوراً رخصت کردو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

داروغہ جی بڑے موقع شناس آدمی تھے۔ مختار صاحب کی باتوں سے انہوں نے اخذ کیا تھا۔ کہ شرما جی اس مال غنیمت میں شریک ہوں گے۔ انکی صاف بیانیاں اسی غلط فہمی کا نتیجہ تھیں۔ اب انہیں اپنی غلطی معلوم ہوتی۔ شرما جی کے تیور دیکھے۔ آنکھوں سے غصہ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ان کے رسوخ اور وقار سے واقف تھے۔ قریب آکر بولے۔ "جناب آپکے مختار صاحب نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ ورنہ حلف سے کہتا ہوں۔ یہاں ہرگز یہ شر نہ برپا کرتا۔ آپ میرے دوست بابو کو کلت سنگھ کے محسن ہیں۔ اور اس لحاظ سے میں آپکو اپنا مربی سمجھتا ہوں۔ اپنے ہی گھر میں آگ نہ لگاتا۔ لیکن اس شخص نے مجھے بڑا چکمہ دیا۔ اور میں بھی ایسا احمق تھا۔ کہ اس چکمے میں آ گیا۔ میں سخت نادم ہوں۔

اور آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ (آہستہ سے) میری ایک دوستانہ صلاح قبول فرمایئے اس مختار کو جس قدر جلد ممکن ہو۔ الگ کر دیجئے۔ یہ آپکی ریاست کو تباہ کیے ڈالتا ہے۔"

(۸)

منشی بابولال اپنے دروازے پر بیٹھے ہوئے اسی ماجرے کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔

شیو دین :۔ "بھیا آپ جا کے درگا کو کیوں نہیں سمجھاتے؟ رام رام ایسا اندھیر!"

بابولال :۔ "بھئی میں دوسرے کے معاملے میں دخل دینے والا کون؟ شرما جی تو وہیں ہیں۔ ان کی مرضی جیسی ہوگی۔ ویسا کریں گے۔ یہ آج کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ دیکھتے تو ہو۔ کہ ہر مہینہ ایک نہ ایک نشتر لگا رہتا ہے۔ یہ سب مختار صاحب کے کرتوت ہیں۔ شرما جی متین آدمی ہیں۔ شرافت اور ملائمت سے پیش آتے ہیں۔ مختار نے سمجھا ہوگا۔ وہ اس معاملہ میں بھی زبان نہ کھولیں گے۔ اور غالباً اس کا خیال صحیح نکلا۔ ورنہ شرما جی کے روبرو یہ طوفان کیونکر مچتا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ۔ اب کی کتنی اوکھ بوئی ہے؟"

رامداس :۔ "اوکھ تو بہت ہے۔ پر جب دشمنوں کے مارے بچے بھیا تم مانتے نہیں ہو۔ یہ آنکھ دیکھی بات ہے۔ کہ کڑاہ کڑاہ رس جل گیا۔ اور پاؤ بھر مال بھی نہ پڑا۔ نہ جانے ایسا کون سا منتر مار دیتے ہیں؟"

بابولال :۔ "اچھا۔ اب کے میرے کہنے سے یہ نقصان اٹھا لو۔ دیکھو

ایسا کون بڑا منتر باز ہے جو گڑھا ہموں کا رس جلا دیتا ہے۔ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے۔ اب کے میرے سامنے گڑہ بنانا۔ اور کسی باہر کے آدمی کو مت آنے دینا۔ پھر دیکھوں کیسے مال نہیں پڑتا۔ اس گاؤں میں جتنے کولھو زمین میں دھنسے پڑے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں بہت اوکھ ہوتی ہوگی۔"

شیودین :۔ "بھیا ہمارے ہوش میں یہ سب کولھو چلتے رہے ہے۔ ماگھ پوس میں رات بھر بجارتگی رہتی تھی۔ پر جب سے یہ بدیا پھیلی ہے۔ تب سے کوئی اوکھ کے پاس نہیں جاتا۔"

بابولال :۔ "ایشور چاہیں گے۔ تو پھر ویسی ہی اوکھ ہوگی۔ اب کے میں اس منتر کو الٹ دوں گا۔ اوکھ لگ جائے تو تمہاری پٹی میں ایک ہزار کا گڑہ ہو جائے گا۔"

شیودین :۔ "بھیا کیسی بات کہتے ہو۔ اس پٹی میں پچیس بیگھہ سے کم اوکھ نہیں ہے۔ کچھ نہ ہو تو تین چار ہزار کہیں نہیں گئے۔"

بابولال :۔ "تب تو بھائی میں پچاس روپے مل جائیں گے۔ اس سے تمہاری پٹی میں چار لالٹینیں جل سکتی ہیں۔" دفعتاً سامنے سے شرما جی ایک آدمی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ بابولال نے اسامیوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ کرسی رکھوا دی اور چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھی کو بلا لیا ہوتا۔"

شرما جی :۔ "آپ کو کس منہ سے بلاتا۔ میرے آدمی وہاں پٹ رہے تھے۔ ان کا گلا دبایا جا رہا تھا۔ اور آپ قریب نہ پھٹکے۔ مجھے آپ سے مدد کی امید تھی۔"

بابو لال :- "میں واقعی نادم ہوں۔ کہ اس وقت آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت میرے وہاں جانے سے داروغہ جی اور مختار صاحب دونوں بُرا مانتے ہیں۔ یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آئے دِن ایسے سوانگ ہوتے رہتے ہیں۔ اور کچھ اسی گاؤں میں نہیں جہاں دیکھے یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ میں آپ سے اس کا کچھ ذکر نہ کرتا تھا۔ کہ شاید آپ اسے غیبت خیال کریں۔"

شرما جی :- "آخر یہ توجہ تو کرنے ہی۔ مگر میں دیکھتا ہوں۔ کہ اس طرح کام نہ چلے گا۔ اپنی اسامیوں کو آج اس مصیبت میں دیکھ کر مجھے روحانی صدمہ ہوا ہے۔ میرا دل بار بار مجھے نفرین کرتا ہے۔ جن کی کمائی کھاتا ہوں، جن کی بدولت ٹم ٹم پر سوار ہو کر رئیس بنا گھومتا ہوں۔ اُن کے کچھ حقوق مجھ پر بھی تو ہیں۔ مجھے اپنی خود غرضی صاف نظر آ رہی ہے۔ اپنی نظروں میں خود گر گیا ہوں۔ میں ساری قوم کی نجات کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہوں، سارے ہندوستان کا قاضی بننے کا مدعی ہوں۔ مگر اپنے گھر کی خبر نہیں۔ جن کی روٹیاں کھاتا ہوں، اُن کی طرف سے ایسا بے فکر! میں نے ان شرمناک حالات کی اصلاح کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اور اس کام میں آپ کی مدد اور ہمدردی کا سائل ہوں۔ مجھے اپنی شاگردی میں لیجئے۔ میں سچے دل سے آپ کی خدمت میں حاضر رہا ہوں۔ اس بار کے سنبھالنے میں مجھے سہارا دیجئے۔ میری تعلیم نے مجھے کتاب کا کیڑا بنا کر چھوڑ دیا۔ اور صحبت نے خیالی پلاؤ پکانا سکھایا۔ میں انسان نہیں اصولوں کا پتلا تھا ہوں۔ اب مجھے انسان بنائیے۔ میں نے یہیں بود و باش

کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ مگر آپکو بھی شہر سے تعلق ترک کرنا پڑے گا۔ آپ کا جو کچھ نقصان ہو گا۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اپنے تئیں میرا مختارِ کُل سمجھیے۔ اور مجھے عملی زندگی بسر کرنے کا سبق سکھائیے۔ ممکن ہے آپ کے نقشِ قدم پر چل کر میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جاؤں۔

  

بے غرض محسن

(۱)

ساون کا مہینہ تھا۔ دیوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی۔ مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جاکر بولی۔ "اماں جی! آج میں میلہ دیکھنے جاؤنگی۔"

دیوتی پنڈت چنتامن کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھ کر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر اور مہاجنوں کے خلاف خاص خاص حالتوں کے سوا ۲۵ فیصدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

دیوتی کی ساس ایک بچے کو گود میں لئے کھٹولے پر بیٹھی تھیں۔ بہو کی بات سن کر بولیں۔ "بھیگ جاؤ گی۔ تو بچے کو زکام ہو جائیگا۔"

دیوتی:۔ "نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی۔ ابھی چلی آؤں گی۔"

دیوتی کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا۔ دوسری لڑکی۔ لڑکی ابھی گود میں تھی۔ اور لڑکا ہیرامن ساتویں سال میں تھا۔ دیوتی نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے نظر بد سے بچانے کے لئے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دیئے۔ گڑیاں پیٹنے کیلئے ایک خوش رنگ چھڑی دے دی۔ اور اپنی ہمجولیوں کیساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ تھا۔ نیلگوں گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ عورتیں سولہ سنگار کئے ساگر کے پُرفضا میدان میں ساون کی رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں۔ شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی۔ کوئی ملار گاتی۔ کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا۔ پانی کی ہلکی ہلکی پھوار۔ پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریاول۔ لہروں کے دلفریب جھکولے موسم کو توبہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے۔ گڑیاں اپنے سسرال جائیں گی۔ کنواری لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے۔ گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انہیں بدا کرنے آتی ہیں۔ انہیں پانی میں بہاتی ہیں۔ اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہیں۔ مگر دامن عافیت سے نکلتے ہی ان نازو نعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھار ہونے لگتی ہے

دیوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی۔ اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی دفعتہً اس کا پاؤں پھسلا۔ تو پانی میں جا پڑا۔ دیوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کے دم میں وہاں عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔

مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی۔ کہ پانی میں جا کر ممکن ہو۔ تو بچے کی جان بچائے سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے۔ دُھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی! کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیالات آ رہے تھے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر کوئی شخص کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب روتی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ اژدحام دیکھ کر اُتر پڑا۔ اور ایک تماشائی سے پوچھا "یہ کیسی بھیڑ ہے؟" تماشائی نے جواب دیا "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے"۔

مُسافر:۔ "کہاں؟"

تماشائی:۔ "جہاں وہ عورت کھڑی رو رہی ہے"۔

مُسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اُتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ متحیر تھے۔ کہ کون شخص ہے۔ اس نے پہلا غوطہ لگایا۔ لڑکے کی ٹوپی ملی۔ دوسرا غوطہ لگایا تو اس کی چھڑی ہاتھ لگی۔ اور تیسرے غوطے کے بعد جب اوپر آیا۔ تو لڑکا اس کی گود میں تھا۔ تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرۂ پُرشور بلند کیا۔ ماں نے دوڑ کر بچے کو لپٹا لیا۔ اِس اثنا میں پنڈت جنتا مل کے اور کئی عزیز آ پہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا۔ تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب لوگ اپنے گمنام محسن کو ڈھونڈنے لگے۔ تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے۔ سارا میلہ چھان مارا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔

بیس سال گزر گئے۔ پنڈت چنتامن کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔ اس دوران میں اس کی ماں نے ساتوں جاترائیں کیں۔ اور مریں۔ تو ان کے نام پر ٹھاکر دوارہ تیار ہوا۔ دیوتی بہو سے ساس بنی۔ لین دین۔ بہی کھاتہ ہیرامن کے ہاتھ میں آیا۔ ہیرامن اب ایک وجیہہ، لحیم شحیم نوجوان تھا، نہایت خلیق، نیک مزاج۔ کبھی کبھی باپ سے چھپاکر غریب اسامیوں کو قرض حسنہ دیا کرتا۔ چنتامن نے کئی بار اس گناہ کیلئے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں۔ اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرامن نے ایکبار ایک سنسکرت پاٹھ شالا کیلئے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اس پہ ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہ کھایا۔ ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھچی رہتی تھی۔ مگر اس کی یہ ساری شرارتیں ہمیشہ دیوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں۔ جب قصبے کی غریب بادھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے اسامیوں کی عورتیں۔ دیوتی کے پاس آ کر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگتیں۔ تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تب اسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا۔ جب ہیرامن کرت ساگر میں ڈوب گیا تھا۔ اور اس آدمی کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی جس نے اس کے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس کے عمق سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا۔ کہ اسے دیکھ پاتی تو اس کے پاؤں پر گر پڑتی۔ اسے اب کامل یقین ہوگیا تھا۔ کہ وہ انسان نہ تھا۔ بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر

اس کی ساس بیٹھتی تھی۔ اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی تالیسویں سالگرہ تھی۔ دیوتی کیلئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اس کا دست کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا۔ اور یہی ایک بیجا صرف تھا جس میں پنڈت چنتامن بھی اس کے شریک ہو جاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی۔ اور بہت روتی۔ اور آج اپنے گمنام محسن کیلئے اُس کے دل سے جو دُعائیں نکلتیں۔ وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوتی تھیں۔ اُسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سکھ دیکھنا میسر ہوا ہے!

(۳)

ایک دن ہیرامن نے آکر دیوتی سے کہا۔ "اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے۔ کہو تو میں بھی دام لگاؤں؟"

دیوتی :- "سولھوں آنہ ہے؟"

ہیرامن :- "سولھوں آنہ۔ اچھا گاؤں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ بیس ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سو دو سو میں ختم ہو جائیگی"۔

دیوتی :- "اپنے دادا سے تو پوچھو"۔

ہیرامن :- "ان کے ساتھ دو گھنٹے تک سر مغزن کرنے کی کسے فرصت ہے"۔

ہیرامن اب گھر کا مختار کُل ہو گیا تھا۔ اور چنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی تھی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدّے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے۔

دوسرے دن ہیرامن کے نام پہ سری پور ختم ہو گیا۔ مہاجن سے زمیندار

ہوئے۔ اور اپنے نائب اور دو چپراسیوں کو لیکر گاؤں کی سیر کرنے چلے بستی والوں کو خبر ہوئی۔ نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گاؤں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تلک لگایا گیا۔ اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے ان کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختارِ عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جو اسامی زمیندار کے سامنے آتا۔ وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپیے اُن کے پاؤں پہ رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانسو روپوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ مِلا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز، زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ جب اسامیوں کی فہرست ختم ہوگئی تو مختار سے بولے "اور کوئی اسامی تو باقی نہیں ہے؟"

مختار :- "ہاں مہراج۔ ابھی ایک اسامی اور ہے۔ تخت سنگھ۔"

ہیرامن :- "وہ کیوں نہیں آیا؟"

مختار :- "ذرا مست ہے۔"

ہیرامن :- "میں اس کی مستی اُتار دوں گا۔ ذرا کوئی اسے بُلا لائے۔"

تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا آیا۔ اور ڈنڈوت کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے "ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دوں گا۔"

تخت سنگھ نے ہیرامن کی طرف غور سے دیکھ کر جواب دیا۔ "میرے سامنے

بیس زمیندار آئے اور چلے گئے۔ مگر کبھی کسی نے اس طرح گھُرکی نہیں دی۔"
یہ کہہ کر اُس نے لاٹھی اُٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پُوچھا۔" دیکھا زمیندار کو۔ کیسے آدمی ہیں؟"
تخت سنگھ :- "اچھے آدمی ہیں۔ میں انہیں پہچان گیا۔"
ٹھکرائن :- "کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے؟"
تخت سنگھ :- "میری ان کی بیس برس کی جان پہچان ہے۔ گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا۔"
اس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

(۴)

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سری پُور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اُس کی بہو اور بچے سب سری پُور آئے۔ گاؤں کی سب عورتیں ان سے ملنے آئیں۔ اُن میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اس کی بات چیت، سلیقہ اور تمیز دیکھ کر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی۔ تو ریوتی نے کہا۔" ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تم سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔" اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہو گیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی۔ اور ہیرامن اپنے مختارِ عام کے منع لکھنے پر تخت سنگھ کو بیدخل کرنے کی تجویزیں سوچ رہا تھا۔
جیٹھ کی پورنماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی میں میدہ چھان رہی تھی۔ کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا۔
" ٹھکرائن! ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتا ہے۔"

ٹھکرائن :- "تمہارا ایوتا میری آنکھوں پر۔ کون سی برس گانٹھ ہے؟"
دیوتی :- "اُنتیسویں۔"
ٹھکرائن :- "نارائن کرے۔ ابھی ایسے ایسے سو دن تمہیں اور دیکھنے نصیب ہوں۔"
دیوتی :- "ٹھکرائن! تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کئے ہیں۔ تب تم لوگوں کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ ساتویں ہی سال میں تھے۔ کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ کہ یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی۔ ان کی جان انہیں کی دی ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا۔ ان کا پتہ نہ چلا۔ ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سو روپے نکال رکھتی ہوں۔ دو ہزار سے کچھ اوپر ہو گیا ہے۔ بچے کی نیت ہے کہ اُن کے نام سے سری پور میں ایک مندر بنوا دیں۔ سچ مانو، ٹھکرائن! ایکبار اُن کے درشن ہو جاتے۔ تو زندگی سپھل ہو جاتی۔ جی کی ہوس نکال لیتے۔"
دیوتی جب خاموش ہوئی۔ تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔
ٹھکرائن بولی۔ "میں دیوتی رانی کے پاس جاکر دوہائی مچاتی ہوں۔"
تخت سنگھ نے جواب دیا۔ "میرے جیتے جی نہیں۔"

---

(۵)

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جاں بخش فیاضی دکھائی۔ سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزومند نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ جاتیں۔ یہاں تک کہ زمین انہیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ اب دن کے دن اُسے چرایا کرتا۔ اُس کی زندگی کا اب یہی ایک سہارا تھا۔ اُس کے اُپلے اور دُودھ بیچ کر گزران کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کرنے پڑ جاتے۔ یہ سب مُصیبتیں اس نے جھیلیں۔ مگر اپنی بے نوائی کا رونا رونے کیلئے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اُسے زیر کرنا چاہا تھا۔ مگر خود زیر ہو گیا۔ جیتنے پر بھی اُسے ہار ہوئی۔ پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضد کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا۔ "بیٹا! تم نے غریب کو ستایا۔ اچھا نہ کیا۔"

ہیرامن نے تیز ہو کر جواب دیا۔ "وہ غریب نہیں ہے۔ اُس کا گھمنڈ میں توڑ دوں گا۔"

ثروت کے نشے میں متوالا زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا۔ جس کا وُجود ہی نہ تھا۔ جیسے بے سمجھ بچہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

(۶)

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کر کے کاٹا۔ پھر برسات آئی۔ اُس کا گھر چھایا گیا تھا۔ کئی دن تک موسلادھار مینہ برسا۔ تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے

وہاں بندھی ہوئی تھی۔ دب کر مرگئی۔ تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی۔ اُسی دن اُسے بخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا۔ وہ بھی ٹوٹا۔ ظالم، بیدرد مصیبت نے کچل ڈالا۔ سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ کہ دیوتی اس کے گھر گئی۔ تخت سنگھ نے آنکھیں کھولدیں اور پوچھا۔ "کون ہے؟"

ٹھکرائن:۔ "دیوتی رانی ہیں۔"

تخت سنگھ:۔ "میرے دھن بھاگ۔ مجھ پر بڑی دیا کی۔"

دیوتی نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "ٹھکرائن! ایشور جانتا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں۔ تمہیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو۔ تمہارے اوپر ایسی آفت پڑ گئی اور ہمیں خبر تک نہ کی۔"

یہ کہہ کر دیوتی نے روپوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی۔

روپوں کی جھنکار سن کر تخت سنگھ اُٹھ بیٹھا۔ اور بولا۔ "رانی ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں۔ مرتے دم گنہگار نہ کرو۔"

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہوا خواہوں کو لئے اُدھر سے جا نکلا۔ گرا ہوا مکان دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کے دل نے کہا۔ آخر میں نے اُس کا گھمنڈ توڑ دیا۔ مکان کے اندر جا کر بولا۔ "ٹھاکر! اب کیا حال ہے؟"

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا۔ "سب ایشور کی دیا ہے۔ آپ کیسے بھول پڑے؟"

ہیرامن کو دوسری بار ذک ملی۔ اُس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پاؤں پر کر

آنکھوں سے چھوٹے۔ اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اسی رات کو غریب، آزاد منش، ایمان دار، بے غرض ٹھاکر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(۷)

بوڑھی ٹھکرائن اب دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اس کے غم کا شریک اور اس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بے نوائی، بے مائگی نے غم کی آنچ اور بھی تیز کر دی تھی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں۔ مگر مرہم کا کام ضرور کرتے ہیں۔

فکر معاش بری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چن لاتی۔ اور اپلے بنا کر بیچتی۔ اسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا یہاں تک کہ ہیرامن کو بھی اس پر ترس آگیا۔ ایک دن انہوں نے آٹا، دال، چاول، تھالیوں میں رکھ کر اس کے پاس بھیجا۔ دیوتی خود لیکر گئی۔ مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ”دیوتی! جبتک آنکھوں سے سوجھتا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو“

اس دن سے ہیرامن کو پھر اس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دن دیوتی نے ٹھکرائن سے اپلے مول لئے۔ گاؤں میں پیسے کے تیس اپلے بکتے تھے۔ اس نے چاہا کہ اس سے بیس ہی اپلے لوں۔ اس دن سے ٹھکرائن نے اس کے یہاں اپلے لانا بند کر دیا۔

ایسی دیویاں دنیا میں کتنی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی۔ کہ ایک دفعہ اگر بات زبان پر لا کر میں اپنی جان کا ہیوں کا خاتمہ کر سکتی ہوں۔ مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہ ہو جائے گا۔ مثل مشہور ہے۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ شاید اس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا۔ کہ میں نے دیوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضع دار آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی۔ یہ زمانہ اس نے جس تکلیف سے کاٹا۔ اُسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے۔ کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے۔ کھانے والے نہیں۔ کوئی یوں رو رو کر زندگی کاٹتا ہے۔

بڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا۔ مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

(۸)

ہیرامن کی تیسویں سالگرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں۔ دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے معزز براہمنوں کیلئے۔ تیل کی غریب فاقہ کش نیچوں کیلئے۔

یکایک ایک عورت نے دیوتی سے آکر کہا۔ "ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں۔ تمہیں بلا رہی ہیں"۔

دیوتی نے دل میں کہا۔ "ایشور! آج تو خیریت سے کاٹنا۔ کہیں بڑھیا نہ مر رہی ہو"۔

یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے پاس گئی۔ ہیرامن نے جب دیکھا۔ اماں نہیں

جانا چاہتیں۔ تو خود چلا گیا۔ ٹھکرائین پر اُسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر دیوتی مکان کے دروازے تک اُسے منع کرنے آئی۔ یہ رحم دل، نیک مزاج شریف دیوتی تھی۔

ہیرامن ٹھکرائین کے مکان پر پہنچا۔ تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جان کنی کی حالت طاری تھی۔ ہیرامن نے زور سے کہا "ٹھکرائین! میں ہوں ہیرامن"

ٹھکرائین نے آنکھیں کھولیں۔ اور اشارے سے اسے اپنا نزدیک لانے کو کہا۔ پھر رک رک کر بولی "میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہے۔ یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہیرامن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بہ حفاظت رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ شائد جانے والے کا زادِ راہ تھا۔

رات کو ٹھکرائین کی تکلیفوں کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔

اسی رات کو دیوتی نے خواب دیکھا "ساون کا میلہ ہے۔ گھٹائیں چھائی ہوتی ہیں۔ میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں۔ اتنے میں ہیرامن پانی میں پھسل پڑا۔ میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ دفعتہً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کودا اور ہیرامن کو نکال لایا۔ دیوتی اس کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور بولی "آپ کون ہیں؟"

اس نے جواب دیا "میں بسری پور میں رہتا ہوں۔ میرا نام تخت سنگھ ہے"

سری پُور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہے۔ مگر اب اس کی رونق دو چند ہوگئی ہے۔ وہاں جاؤ۔ تو دُور سے شوالے کا سُنہری کلس دِکھائی دینے لگتا ہے۔ جس جگہ تخت سنگھ کا مکان تھا۔ وہاں یہ شوالہ بنا ہُوا ہے۔ اس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہاں ٹھیرتے ہیں۔ اور تخت سنگھ کا گُن گاتے ہیں۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اُس کے نام سے مشہور ہیں۔

  

بڑے گھر کی بیٹی

(۱)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے
بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انہیں
کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں۔ اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس
ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے بدن پر گوشت تو نہ
تھا۔ مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی
لئے اُس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں
کی نذر کی۔ اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب
کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سری کنٹھ سنگھ تھا۔ اُس نے ایک مدت دراز
کی جانکاہی کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور اب ایک دفتر میں نوکر
تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دوہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ

چوڑا سینہ، مچھلیں کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سر کینیتھ اس سے بالکل متضاد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انہوں نے دو انگریزی حروف بی۔ اے پر قربان کر دیا تھا۔ انہیں دو حرفوں نے اس کے سینے کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقت فرصت طب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے سے اکثر کھرل کی خوشگوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سر کینیتھ اس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مداح نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شد و مد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے اور خود ہر روز کوئی نہ کوئی روپ بھرتے۔ انہیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پر جوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے۔ اسے وہ ملک اور قوم کیلئے فال بد خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ گاؤں کی بہوئیں انہیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انہیں اپنا دشمن سمجھتیں۔ خود انہیں کی بیوی ان سے اس مسئلہ پر اکثر زور سے بحث کرتی تھی۔ مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس سسر یا دیور

جیٹھ سے نفرت تھی، بلکہ اس کا خیال تھا، کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے، تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے۔ کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالیشان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن، بہلیاں، شکاری کتے، باز، بہری، شکرے، جرّے، فرش فروش، شیشہ آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں۔ وہ ان سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخدل، حوصلہ مند آدمی تھے۔ مگر قسمت کی خوبی لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں۔ اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو انہوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں۔ مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں۔ ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی۔ مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے۔ کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے۔ کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا۔ کہ اُسے اپنے آپ کو بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس کسی چندے کے لئے روپیہ مانگنے آئے۔ شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور وطریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے۔ اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں۔ تو یہاں کا رنگ ڈھنگ

کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھی۔ ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو کیا ذکر کوئی سجی ہوئی خوبصورت بہلی بھی نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی۔ مگر یہاں باغ کہاں! مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دیہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا۔ گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغابیاں لئے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا۔ جلدی سے گوشت پکا دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی۔ مگر ہانڈی میں دیکھا۔ تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔

لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے "دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"

آنندی نے کہا۔ "گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔"

لال بہاری:۔ "ابھی پرسوں گھی آیا ہے۔ اس قدر جلد اٹھ گیا؟"

آنندی:۔ آج تو کل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔"

جسطرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے۔ اسی طرح بھوک سے

باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بُری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا۔ "میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو۔"

عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے۔ مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی۔ "ہاتھی مرا بھی تو نو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی۔ کہار کھا جاتے ہیں۔"

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی۔ اور بولا۔ "جی چاہتا ہے تالو سے زبان کھینچ لوں۔"

آنندی کو بھی غصہ آیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔"

اب نوجوان اَکھڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا، اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا۔ "جس کے گمان پر بھولی ہو اُسے بھی دیکھوں گا اور تمہیں بھی۔"

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا۔ مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا سے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات سے ہے۔ اُسے شوہر کی طاقت اور ہمت کا ہی گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے کچھ نہ کھایا، نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسبِ معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں، کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے۔ اور سلسلۂ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا۔ تو لال بہاری نے کہا۔ "بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجیے گا۔ کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں، ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔"

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں۔ کہ مردوں کے منہ لگیں۔"

لال بہاری :- "وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں۔ تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔"

سری کنٹھ :- "آخر بات کیا ہوئی؟"

لال بہاری :- "کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں۔ میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

سری کنٹھ کھانا کھا کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا "مزاج تو اچھا ہے؟"

سری کنٹھ بولے :- "بہت اچھا ہے۔ یہ آجکل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"

آنندی کے تیوروں پہ بل پڑ گئے۔ اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آگیا۔ بولی۔ "جس نے تم سے یہ آگ لگائی۔ اُسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔"

سری کنٹھ :- "اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو، کچھ بات تو کہو؟"

آنندی :- "کیا کہوں۔ قسمت کی خوبی ہے۔ ورنہ ایک گنوار لونڈا جیسے چپراس گری کرنے کی بھی تمیز نہیں، مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں اکڑتا پھرے۔ بوٹیاں نچوا لیتی۔ اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے۔"

سری کنٹھ :- "آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔"

آنندی :- "پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا۔ دال میں گھی کیوں نہیں۔ بس اسی پہ میرے میکے کو بُرا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ بولی۔ کہ وہاں آنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں۔ اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری۔ اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی۔ تو سر پھٹ جاتا۔ اس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ سچ ہے یا جھوٹ؟"

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے :- "یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔"

آنندی رونے لگی۔ جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے۔ کیونکہ آنسو انکی پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصے پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا۔ انہیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جاکر بولے۔ "دادا۔ اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔"

اس معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کیلئے سری کنٹھ سنگھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب ان کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا۔ تو وہ اس کا مضحکہ اڑاتے۔ اور کہتے۔ تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ انہیں قابو میں رکھنے کی بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پُرجوش وکیل آج اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔" ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے۔ جبتک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش کے بیچ میں آکر ضبط اور حلم رخصت ہو جاتے ہیں۔

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے۔ "کیوں؟"

سری کنٹھ:۔ "اس لیئے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیئے۔ وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا۔ گھر پر

رہتا نہیں ۔ اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بھرمار ہوتی ہے ،
کڑوی بات تک مضائقہ نہیں ۔ کوئی ایک کی دو کہہ لے ۔ یہاں تک میں ضبط
کر سکتا ہوں ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں اور میں
دم نہ ماروں ۔"

بینی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے ۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کرتے
تھے ۔ ان کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہو گیا ۔ صرف اتنا بولا ۔
" بیٹا تم عقلمند ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو ۔ عورتیں اس طرح گھر تباہ کر دیتی
ہیں ۔ ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں ۔"

سری کنٹھ :۔ " اتنا میں جانتا ہوں ۔ آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں
ہوں ۔ آپ خود جانتے ہیں ۔ کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علیحدگی
کی آفتوں سے بچا دیا ہے ۔ مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا میں ایشور
کے دربار میں ذمہ دار ہوں ۔ اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں
سہ سکتا ۔ آپ یقین مانیئے ۔ میں اپنے اوپر بہت جبر کر رہا ہوں کہ لال بہاری
کی گوشمالی نہیں کرتا ۔"

اب بینی مادھو سنگھ بھی گرمائے ۔ یہ کفر زیادہ نہ سن سکے ۔ بولے " لال بہاری
تمہارا بھائی ہے ۔ اس سے جب کبھی بھول چوک ہو ، تم اس کے کان پکڑ لو ،
مگر ...."

سری کنٹھ :۔ " لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا ۔"
بینی مادھو :۔ " عورت کے پیچھے ؟ "

سری کنٹھ :- "جی نہیں - اس کی گستاخی اور بیرحمی کے باعث!"

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ کہ لال بہادری سے کوئی گستاخی یا بےرحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ تمباکو اڑانے کیلئے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا۔ کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں۔ تو ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سننے کیلئے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے۔ جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا تھا۔ اس لئے وہ خطاوار ہے۔ اس نے اتنا علم حاصل کیا۔ یہ بھی اس کی خطا ہے۔ بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ اُن کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج اُمیدیں بر آئیں۔ حقہ پینے کے بہانے سے کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلے سے آ آ کر بیٹھ گئے۔ بینی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے۔ اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ انہیں خوش نہ ہونے دوں گا۔ خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجۂ تقریر نرم کر کے بولے :- "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں تمہارا جو جی چاہے کرو۔ اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی"!

الہ آباد کا نوجوان، جھلایا ہوا گریجوایٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے

ڈیبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر عملی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جب مقصد سے پہلو بدلا تھا۔ وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا۔ "میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ:۔ "بیٹا! تم عقلمند ہو۔ اور عقلمند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے۔ اس سے جو کچھ خطا ہوئی ہے، اُسے تم بڑے بن کر معاف کر دو۔"

بیٹا:۔ "اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا۔ یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجئے۔ میں اپنا بوجھ آپ اُٹھالوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیئے۔ جہاں چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اُسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یا حقہ پی لے۔ یا پان کھالے۔ باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں اُنھوں نے کبھی اُسے گھُرکا تک نہ تھا۔ جب الٰہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لیئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مگدر کی جوڑی انہیں نے بنوا دی تھی۔ پچھلے سال جب اُس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا۔ تو انھوں نے خوش ہو کر اکھاڑے

ہی میں جاکر اُسے گلے سے لگالیا تھا۔ اور پانچ روپئے کے پیسے لٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا۔ کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں؟ میں اُن کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں ان سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں اُن کے سامنے کیسے اُٹھیں گی۔ اس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بُلا کر سمجھا دیں گے۔ اس اُمید کے خلاف آج وہ انہیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا۔ مگر اس کا دل کہتا تھا۔ کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر بھیا اُسے اکیلا بلا کر دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو۔ چار طمانچے بھی لگا دیتے۔ تو شاید اُسے اتنا ملال نہ ہوتا۔ مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت کرتا ہوں۔ لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں آیا۔ اور کوٹھڑی میں جاکر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پونچھیں۔ جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازے پر آکر بولا۔ ”بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لئے اب میں جاتا ہوں۔ انہیں پھر منہ نہیں دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے۔ اُسے معاف کرنا۔“

یہ کہتے کہتے بہاری لال کی آواز بھاری ہو گئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُسی وقت سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا۔ تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور کترا کر نکل گئے۔ گویا اس کے سائے سے بھی پرہیز ہے ٭

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی۔ مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی۔ اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجلا رہی تھی، کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الہ آباد چلنے کو نہ کہہ دیں۔ تو پھر میں کیا کروں گی۔ اس کے چہرے کو زرد کئے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سنا کر" اب میں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے۔ معاف کرنا۔" تو اس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کیلئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا۔ "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ :۔ "تو میں کیا کروں؟"

آنندی :۔ "اندر بلا لو۔ میری زبان میں آگ لگے۔ میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اٹھایا۔"

سری کنٹھ :۔ "میں نہیں بلانے کا۔"

آنندی :۔ "پچھتاؤ گے۔ انہیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل

دیں۔

سرکنٹھ نہ اُٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ "بھابی! بھیا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لئے میں بھی اپنا منہ انہیں نہ دکھاؤں گا۔"

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا۔ اور تیزی سے باہر کے دروازہ کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے کمرے سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "مجھے جانے دو!"

آنندی:- "کہاں جاتے ہو؟"

لال بہاری:- "جہاں کوئی میرا مُنہ نہ دیکھے۔"

آنندی:- "میں نہ جانے دوں گی!"

لال بہاری:- "میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

آنندی:- "تمہیں میری قسم۔ اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔"

لال بہاری:- "جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے گا۔ کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا یا نہیں۔ تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔"

آنندی:- "میں ایشور کی سوگند کھا کر کہتی ہوں۔ کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔"

اب سرکنٹھ کا دل پگھلا۔ اُنہوں نے باہر آ کر لال کو گلے لگا لیا۔ اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بھیا! اب کبھی نہ کہنا۔ کہ تمہارا منہ نہ دیکھوں گا۔ اس کے سوا جو سزا آپ دینگے وہ میں خوشی سے

قبول کر دوں گا۔"

سر بیجنیٹ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "للو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ۔ اپنے وچن کا دھیان رکھنا، میں تمہارا بندہ ہوں اور میرا گھر تمہارا گھر ہے۔ اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔"

بینی مادھو سنگھ پھر سے آ رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اٹھے۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں۔"

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا۔ ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

  

بانگِ سحر

(۱)

شیخ وذاقی موہن شیخ پورہ کے مکھیا تھے۔ گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ داروغہ جی انہیں بغیر ٹاٹ کے زمین پر کبھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اور یہ اعزاز کچھ غیر مناسب نہیں تھا۔ مکھیا صاحب کی مرضی کے بغیر گاؤں میں ایک پتا بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ میاں بیوی کی شکر رنجیاں، ساس اور بہو کے قضیے اور اسی قبیل کی دیگر رنگین وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی تنقیح، تجویز اور فیصلہ سب مکھیا صاحب کے دربار ہی میں ہو جاتا تھا۔ ہاں وہ اپنی ان مشفقانہ خدمات کی کچھ نہ کچھ فیس ضرور لے لیا کرتے تھے۔ وہ فریقین سے بہت دانشمندی کے ساتھ فرماتے۔ "آخر عدالت میں معاملہ جائیگا۔ سینکڑوں روپیہ پانی ہو جائے گا، تکلیف، پریشانی، ہرج یہ مزید برآں۔" مصارف کثیر کے دیکھتے ہوئے اگر تھوڑی سی فیس میں کام نکل جائے تو کس کو شکایت کا موقع ہو سکتا تھا۔

لیکن اگر اتنی سچی خدمت پر بھی کوئی مکھیا صاحب سے بدظن ہو جائے۔ یا زیادتی کی شکایت کرے تو یہ اُس کی نادانی تھی۔ اس پر چاہے انہیں کوئی بھلا کہے یا بُرا، کوئی خوش ہو یا ناراض۔ وہ مطلق رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ "مروت" "فرزندانِ" ہاں کی شرافت و انسانیت اس حالت میں بھی انہیں رعایت پر مجبور کر دیتی تھی۔ اگر فیس نقد مہیا نہ ہو سکے۔ تو وہ مکان یا جائیداد منقولہ کا بیعنامہ لکھا لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ متعاز علین بالکل فاقہ مست ہوتے جنہیں نہ پیٹ کی روٹی میسر، نہ تن کا کپڑا۔ مگر شیخ صاحب کا خدا بھلا کرے، وہ اپنے آستانِ عدالت سے انہیں بھی مایوس و محروم نہ آنے دیتے تھے صرف فیس مقررہ کی دوگنی رقم کی "پچیس روپے سینکڑے" سود کی شرح سے ایک دستاویز لکھا لیتے۔ ان ہمدردیوں کا یہ نتیجہ تھا، کہ گاؤں کے سارے آدمی۔ کیا غربا، کیا متوسط ان کے دامِ شرافت میں گرفتار تھے۔ رہے دولت والے، ان سے شیخ صاحب کا دوستانہ تھا، اُن سے دب کر رہتے۔ چار باتیں سن کر غم کھا جاتے مگر ان کے غم اور داروغہ جی کے غصہ میں کوئی روحانی یا خلقی نسبت تھی۔ اس لئے اس خاص حلقے میں شیخ جی ایک خوفناک دوست، تھے، اور قاتل دشمن سمجھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جی کے خوشۂ حیات میں تین دانے تھے۔ فرزند اکبر شیخ جمراتی ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ڈاکیہ کے رجسٹر پر دستخط کر لیتے۔ بڑے قانون دان معاملہ فہم۔ تجربہ کار کُرتے کے بجائے قمیص پہنتے۔ صدری کے بجائے واسکٹ

زیب بر کرتے اور کبھی سگریٹ سے بھی شوق فرماتے۔ اگرچہ ان کی یہ فضول خرچیاں شیخ وفاقی کو حد درجہ ناپسند تھیں، مگر مجبور تھے۔ کیونکہ عدالت اور قانون کے معاملات اسی کے ہاتھوں انجام پاتے۔ وہ قانون کا پتلا تھا، قانونی دفعات اس کی نوک زبان تھیں، قانونی اصطلاحوں میں باتیں کرتا اور فنِ شہادت میں تو ید طولیٰ رکھتا تھا۔ منجھلے صاحبزادے میاں شبراتی ایسے صاحب دماغ نہ تھے۔ مگر بلا کے جفاکش۔ صیغۂ زراعت ان کے سپرد تھا۔ جہاں گھاس بھی نہ جمتی ہو، وہاں کیسر پیدا کر دیں۔ لے دے میاں خیراتی وہ ایک زندہ دل نوجوان تھے، محرم میں ڈھول اس زور سے بجاتے کہ گاؤں میں شورِ قیامت برپا ہو جاتا۔ مچھلی کا شکار ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ رنگین طبیعت پائی تھی، دف بجا بجا کر جب وہ مستانہ ادا سے خیال گاتے تو سماں چھا جاتا۔ دنگل کا ایسا شوق کہ منزلوں کا دھاوا مارتے۔ مگر اُن کی ان عرق ریزیوں کی گھر والے بالکل قدر نہ کرتے تھے۔ پدر بزرگوار اور برادران نیک شعار نے تو اس کو عضوِ معطل سمجھ رکھا تھا۔ گھر کی دھمکی، پند و نصیحت، منت و سماجت، ان کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ مگر مستقل مزاج بھاوجیں ابھی تک اس کی طرف سے مایوس نہیں ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک اسے کڑوی دوائیں پلاتی جاتی تھیں۔ مگر کاہلی وہ رازج روگ ہے۔ جس میں کا مریض کبھی نہیں سنبھلتا۔ ایسا کوئی دن نہ جاتا۔ کہ میاں خیراتی کو ان ہر دو خاتونوں کی تلخ زبانیوں کا آماجگاہ نہ بننا پڑتا ہو۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کبھی کبھی اس کے فولادی دل میں چبھ بھی جاتے۔ اگر ان زخموں پر کوئی مرہم رکھنے والا تھا،

تو یہ اُس کی غمگسار بیوی تھی۔ مگر اُس کے مرہم بھی ایسے تیز ہوتے کہ زخم پر نمک کا کام دیتے۔

لیکن میاں خیراتی پر ان پے در پے چرکوں اور نمک پاشیوں کا اثر ایک شب سے زیادہ نہ قائم رہتا۔ صبح ہوتے ہی کسل و ماندگی کے ساتھ یہ زخم بھی رفع ہو جاتا تھا۔ تڑکا ہوا۔ اُس نے منہ ہاتھ دھویا۔ بنسی اُٹھائی اور تالاب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ بھاوجیں گل ریزیاں کرتی رہتیں۔ بوڑھے شیخ پینترے بدلتے رہتے۔ برادران نیک شعار سرگوشیاں کیا کرتے۔ مگر اپنی دُھن کا پُورا خیراتی اس نرغے سے یُوں اکڑتا، اینڈتا ہُوا نکل جاتا، جس طرح ایک مست ہاتھی بھونکتے ہُوئے کتوں کے بیچ سے نکل جاتا ہے۔ اُسے راہ راست پر لانے کے لئے کیا تدبیریں نہیں کی گئیں۔ باپ سمجھاتا۔ "بیٹا! ایسی راہ چلو۔ جس میں تمہیں بھی چار پیسے ملیں۔ اور گرہستی کا بھی نباہ ہو۔ بھائیوں کے بھروسے کب تک رہو گے؟ میں تو چل چلاؤ پر ہوں۔ آج ٹیک پڑوں، کل ٹیک پڑوں پھر تمہاری کیسے گزر ہوگی۔ بھائی لوگ بات بھی نہ پوچھیں گے؟ بھاوجوں کا رُخ دیکھ ہی رہے ہو۔ آخر تمہارے بھی بیوی بچے ہیں۔ ان کا بوجھ کیسے سنبھالو گے؟ کھیتی میں جی نہ لگے۔ کہو کوئی دوکان کھلوا دوں۔ کچھ لین دین کرو۔ کچھ تو کرو۔" خیراتی کھڑا کھڑا یہ سب سنتا رہتا۔ مگر پھر کا دیتا تھا۔ ان باتوں سے کبھی نہ پسیجتا۔ ایکبار جب کئی دن تک اُس کی بیوی روٹھی رہی۔ ان حضرت کی خرمستیوں کا خمیازہ اُس بے زبان کو بھگتنا پڑتا۔ گھر کے جتنے مشکل ترین کام ہوتے وہ اسی کے سر تھوپے جاتے۔ اُپلے پاتھتی۔ کنوئیں سے پانی لاتی۔ آٹا پیستی۔ اور اتنے پر بھی جیٹھانیاں

سیدھے منہ سے بات نہ کرتیں۔ تیوروں سے پہچان لیا کرتیں۔ آخر جب وہ شوہر سے کئی دن روٹھی رہی۔ تو میاں خیراتی کچھ نرم ہوئے رہا ہے جا کر کہا کہ مجھے کوئی دکان کرا دیجئے۔ شیخ جی نے خدا کا شکر کیا۔ پھولے نہ سمائے۔ کئی سو روپیہ لگا کر بزازی کی دکان کھولی۔ خیراتی کا نصیب چمکا۔ تنزیب کی اچکن بنوائی۔ ململ کا صافہ دھانی رنگ میں رنگوایا۔ سودا بکے یا نہ بکے آٹھ پہر ہی ہوتا تھا۔ دکان کھلی ہوئی ہے۔ دس۔ پانچ احباب دلنواز جمع ہیں۔ چرس کے دم اڑ رہے ہیں۔ اور خیال کی ترنگیں اٹھتی ہوتی ہیں۔

مجنوں کا معشوق چھیلا۔ چلے چال مستانہ

اس طرح تین مہینے ہنسی سے کٹے۔ خیراتی نے خوب دل کے ارمان نکالے یہاں تک کہ ساری لاگت نفع ہو گئی۔ ٹاٹ کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ بچا۔ شیخ جی کنوئیں میں گرنے چلے۔ بھادجوں نے کہرام مچایا۔ غضب خدا کا ہمارے بچے اور ریشم لنگوٹی کو ترسیں۔ گاڑھے کا ایک کرتا بھی ملا ہوتا۔ تو دل کو تسکین ہوتی اور ساری دکان اس شہدے کا کفن بن گئی۔ اب کون منہ دکھلائے گا۔ کون منہ لیکر گھر میں قدم رکھے گا۔ مگر خیراتی خاں وہی منہ لئے ہوئے پھر گھر میں آئے پھر وہی زنار قدیم اختیار کی۔ خیراتی اس کا پُرلطف لباس دیکھ کر جل جاتا۔ میں صبح سے شام تک بیل کی طرح پسینہ بہاؤں۔ مجھے نین سکھ کا کرتا نہ میسر ہو۔ اور یہ ایا ہج دن بھر چارپائی توڑے اور اس شان سے بن ٹھن کر نکلے۔ ایسے کپڑے تو شاید مجھے اپنی شادی میں بھی نہ ملے ہوں گے۔ میاں جمعراتی کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی فاسد خیالات پیدا ہوئے کرتے۔ آخر جب یہ جلن نہ سہی گئی۔ اور

شعلہ دہکار تو ایک روز شبراتی کی بیوی میاں خیراتی کے سارے کپڑے اُٹھا لائیں۔ اور اُن پر مٹی کا تیل انڈیل کر آگ لگا دی۔ شعلے بلند ہوئے خیراتی روتے تھے۔ دونوں بھائی اور دونوں بھاوجیں تالیاں بجاتی تھیں۔ میاں وفاتی نے یہ نظارہ دیکھا۔ اور سر پیٹ لیا۔ یہ نفاق کی آگ ہے۔ گھر کو جلا کے راکھ کر دے گی۔

(۳)

یہ شعلہ تو فرو ہوا۔ مگر دلوں کے شعلے جُوں کے توں دہکتے رہے۔ آخر بوڑھے میاں وفاتی نے گھر کے سب آدمیوں کو جمع کیا۔ اور میاں جمعراتی سے جنہیں فرزندِ رشید ہونے کا فخر تھا۔ مخاطب ہو کر بولے۔ "بیٹا جمعراتی! تم نے آج کا حال دیکھا۔ سینکڑوں روپیہ پر پانی پھر گیا۔ کسے کیا کہوں۔ بس اس طرح نباہ نہیں ہو سکتا۔ تم سمجھدار ہو۔ مقدمہ معاملہ سمجھ کر کرتے ہو۔ ایسی کوئی راہ نکالو کہ گھر تباہی سے بچے۔ میں تو یہ چاہتا تھا۔ کہ اپنی زندگی بھر سب کو سمیٹے رہوں۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہے۔"

میاں جمعراتی اپنے قانونی تجربہ و علم کی بنا پر کچھ جواب دینے ہی والے تھے۔ کہ ان کی بیوی صاحبہ نے پیش قدمی کی۔ اُن کی قانون دانی یہاں پر ہمیشہ پس پشت رہ جاتی تھی۔ "میاں اب سمجھانے بجھانے سے یوں کام نہ چلے گا۔ سہتے سہتے ہمارا کلیجہ پک گیا۔ بیٹے کی جتنی پیڑ باپ کو ہو گی۔ اتنی کیا اس کی آدھی بھی بھائی کو نہیں ہو سکتی۔ میں تو بات صاف کہتی ہوں۔ خیراتی کا تمہاری کمائی میں حق ہے۔ انہیں سونے کے کور کھلاؤ اور چاندی کے ہنڈولے میں جھلاؤ۔

ہم میں نہ اتنا بوتا ہے۔ نہ اتنی ہمت ہے۔ ہم اپنی جھونپڑی الگ بنا لیں گے۔ ہاں جو کچھ ہمارا ہو۔ وہ ہم کو ملنا چاہیئے۔ کل بانٹ بجھرا کر دیجیئے۔ بلا سے چار آدمی نہ کہیں گے۔ کہ بھائی کو نکال دیا۔ اب کہاں تک دنیا کی لاج دھوئیں"۔

میاں جمعراتی کے دل پر اس مرچ زدہ وکالت نے جو اثر کیا وہ چہرہ سے جھلک رہا تھا۔ کہ ان میں خود اتنی جرأت نہیں تھی۔ کہ صورت حال کو اس صفائی سے پیش کر سکتے۔ قانونی اہمیت کے ساتھ بولے۔ " اس کے تو سوا مجھے اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جائیداد مشترک حسب قانون دیوانی آپ کے حین حیات تقسیم کی جا سکتی ہے"۔

اب میاں شبراتی کی باری آئی۔ مگر غریب کسان بیلوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے والا۔ ایسے اہم معاملات میں زبان کھولنے کی کیونکر جرأت ہوتی کشمکش میں پڑا ہوا تھا۔ بارے اس کی وفادار بیوی نے اپنی جٹھانی کی تقلید کر کے یہ مشکل آسان کی۔ " رحیمن بہن نے جو راہ نکالی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اب اسی طرح کام چلے گا۔ کوئی تو کلیجہ توڑ توڑ کے محنت کرے۔ نہ دن کو دن سمجھے۔ نہ رات کو رات۔ ایک ایک پیسے کو ترسے کبھی تن ڈھانکنے کو لستر تک نہ ملے۔ اور کوئی میٹھے ٹکڑے کھائے۔ اور چین کی نیند سوئے۔ ہم چھاتی پھاڑ کے کمائیں۔ دوسرے ہاتھ بڑھا کے کھائیں۔ ایسی اندھیر نگری میں اب ہمارا گزر نہ ہو گا۔ ہم بھی اپنی ہانڈی الگ جلائیں گے۔ جو روکھا سوکھا اللہ دے گا۔ کھائیں گے اور اس کا شکر کریں گے"۔

میاں شبراتی کے چہرہ کی شگفتگی اور بشاشت بتلا رہی تھی۔ کہ یہ آواز گو

دوسرے قالب سے نکلی ہے۔ مگر اسی کی ہے۔ بیج اسی کے دل میں اگا تھا، مگر ذخیرہ سے کھیت میں پہنچ کر وہ زیادہ مضبوط اور سرسبز ہو گیا ہے۔ صرف ان کی تصدیق کی ضرورت تھی۔ سر ہلا کر اور خیراتی کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھکر بولے "ہاں! بات تو یہی ہے"۔

بوڑھے شیخ جی نے اب خیراتی کی طرف روئے سخن کر کے فرمایا، "کیوں بیٹا تمہیں بھی یہی منظور ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ یہ دہکتی ہوئی آگ اب بھی بجھ سکتی ہے۔ کام سب کو پیارا ہوتا ہے۔ چام کسی کو پیارا نہیں ہوتا۔ بولو کیا کہتے ہو؟ کچھ روزی روزگار کروگے یا ابھی آنکھیں نہیں کھلتیں؟"

خیراتی بھائیوں کی اس بے رحمی پر جھنجھلا گیا تھا۔ اُسے ایسا غصہ آتا تھا کہ ان عورتوں کی زبان تالو سے کھینچ لے۔ یوں تو بہت متحمل آدمی تھا، مگر تنگ آمد و سخت آمد کا مسئلہ تھا۔ بولا "جو کچھ بھائی صاحبوں کی مرضی ہو۔ میرے دل سے بھی لگی ہوئی ہے۔ میں بھی اس خنجر سے اب بھاگنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے نہ محنت مزدوری ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ جس کے نصیب میں جتنی پیسنی لکھی ہو، وہ پیسے۔ میرے نصیبوں میں تو عیش کرنا لکھا ہوا ہے۔ میں کیوں اپنا سر اوکھلی میں دوں؟ میں تو کسی سے نہیں کہتا کہ یہ کام کر، وہ کام کر۔ پھر لوگ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ جسے کام کرنا ہو کرے نہ کرنا ہو، نہ کرے۔ جب میں کہوں، کہ مجھے پلاؤ، کھلاؤ، مخمل پہناؤ، تب میری زبان کاٹ لو۔ آخر میرے ذمے تین ہی جانیں ہیں۔ بچے ابھی نادان

ہے۔ کھیلنا، کودنا اس کا کام ہے۔ کیا وہ اس کام سے جی چراتا ہے؟ گھر والی ہے۔ وہ سارے خاندان کی لونڈی ہے۔ پانی وہ بھرے۔ چکی وہ پیسے۔ اُپلے وہ پاتھے۔ کیا وہ کام سے جی چراتی ہے؟ رہ گیا میں۔ بس میرا ہی پیٹ بھاری ہے نا۔ آپ لوگ اپنی فکر کیجئے۔ مجھے اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ مجھے آدھ سیر آٹے کی کمی نہیں ہے۔ جیسی سر پہ آئے گی بھگت لوں گا؟

اس قسم کی خاندانی کنفرنسیں بلاہا ہوتی تھیں۔ مگر معمولی تمدن دلکی کنفرنسوں کی طرح ان سے بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ دو، تین دن خیراتی نے گھر پہ کھانا نہیں کھایا۔ جتن سنگھ ٹھاکر شوقین آدمی تھے۔ خیال کے عاشق۔ ان کے چوپال میں پڑا رہتا۔ آخر میاں وفاتی گئے اور منا کر لائے۔ اور پھر پرانی بوسیدہ مشین قدیم رفتار پہ۔ اڑتی۔ مچلتی۔ شور مچاتی چلنے لگی۔

(۴)

قاضی کے گھر کے چوہوں کی طرح شیخ وفاتی کے گھر کے بچے بھی سمجھ دار تھے۔ ان کیلئے مٹی کے گھوڑے، مٹی کے گھوڑے اور کاغذ کی چڑیاں، کاغذ کی چڑیاں تھیں۔ پھلوں کی مضر تاثیرات کا انہیں بہت وسیع علم تھا۔ گولر اور جنگلی بیر کے سوا اور ایسا کوئی پھل نہ تھا جسے وہ بیماریوں کا گھر نہ سمجھتے ہوں۔ مگر گردین کے خوانچہ میں کچھ ایسی پُرزور کشش تھی، کہ ہفتوں کی متواتر تعلیم و تربیت کے اثر کو دم زدن میں کافور کر دیتی۔ وہ عام بچوں کیطرح اگر سوتے بھی ہوں۔ تو گلابی ریوڑیوں کی میٹھی صدا سنتے ہی چونک پڑتے تھے۔ گردین ہفتہ وار بلاناغہ چکر لگاتا۔ اس کی آمد کے انتظار اور اشتیاق میں بچوں کو بلاکسی

مدرس کی امداد کے اعداد اور دِنوں کے نام یاد ہو گئے تھے۔ بوڑھا سا میلا کچیلا بے ڈول آدمی تھا۔ مگر قرب وجوار کے مواضعات میں اُس کا نام ضدی اور شریر بچوں کیلئے جادو سے کم اثر نہ رکھتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس کے خوانچہ پر بچوں کی ایسی یورش ہوتی۔ کہ مکھیوں اور بھِڑوں کی فوجِ عظیم کو بھی راہِ فرار اختیار کرنا پڑتی۔ اور اگر بچوں کیلئے خوانچہ کی مٹھائیاں تھیں۔ تو ماؤں کے لئے اس سے بھی زیادہ میٹھی قند و شکر کی سی باتیں تھیں۔ ماں منع کرتی رہے۔ حیلے کرے۔ ابھی پیسے نہیں ہیں۔ کل لے دوں گی۔ مگر وہ جھٹ پٹ مٹھائیوں کا دونا بچہ کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ اور فلسفیانہ انداز سے کہتا "بہو جی پیسوں کیلئے کچھ فکر نہ کرو۔ پیسے پھر مل رہیں گے۔ کہیں بھاگے تھوڑے ہی جاتے ہیں۔ نارائن نے تمہیں بچے دیئے ہیں۔ تو مجھے بھی اُن کی نچھاور مل جاتی ہے۔ انہیں کی بدولت میرے بچے بھی جیتے ہیں۔ ابھی کیا۔ ایشور ان کا سہرا تو دکھائے پھر دیکھنا۔ گردین کیسا ٹھنگن کرتا ہے۔" اس کا یہ وتیرہ اُصولِ تجارت کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ نو نقد نہ تیرہ اُدھار کی مثل عملی تجربہ اور صداقت پر ہی کیوں نہ مبنی ہو۔ مگر گردین کو اپنی نرالی روش پر پچھتانے یا اس میں ترمیم کرنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔

منگل کا مبارک دن تھا۔ بچے بڑی بے چینی کے ساتھ اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے گردین کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بعض حوصلہ مند لڑکے درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور بعض فرطِ اشتیاق سے گردین کے استقبال کیلئے گاؤں سے باہر نکل گئے تھے۔ آفتاب اپنا سنہرا دسترخوان لئے ہوئے مشرق سے پچھم کیطرف

چلا جاتا تھا، کہ یکایک گردین آتا ہوا دکھائی دیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر اس کا دامن پکڑا، اور آپس میں کشمکش ہونے لگی۔ کوئی کہتا تھا میرے گھر چلو۔ کوئی اپنے گھر چلنے کی دعوت دیتا تھا۔ سب سے پہلے شیخ وفاتی کا مکان تھا۔ گردین نے یہیں اپنا خوانچہ اتار دیا۔ اور مٹھائیوں کی لوٹ شروع ہو گئی۔ عورتوں اور بچوں کا ٹھٹ لگ گیا۔ خوشی اور رنج، قناعت اور ہوس، حسد اور جلن، افلاس اور فراغت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ چھوٹے پیمانے کی دنیا آباد ہو گئی۔ شیخ جمعراتی کی بیوی رحیمن اپنے تینوں لڑکوں کو لئے ہوئے نکلیں۔ شراتی کی اہلیہ محترمہ بھی اپنی دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے جلوہ افروز ہوئیں اور ایک ایک پیسے کی ریوڑیاں ہر ایک کیلئے مانگیں۔

گردین نے شکر آمیز باتیں شروع کیں۔ پیسہ صندوقچی میں رکھا۔ دھیلے دھیلے کی مٹھائی دی اور دھیلے دھیلے کی دعائیں۔ لڑکے دونے لئے ہوئے بغلیں بجاتے گھر میں داخل ہوئے۔ ریوڑیوں کی عام بارش ہوئی۔ سارے گاؤں میں صرف ایک بد قسمت بچہ تھا جو گردین کے خوانِ کرم سے بے فیض رہ گیا۔ اور یہ میاں خیراتی کا لڑکا رمضانی تھا۔

(۵)

یہ مشکل تھا۔ کہ رمضانی اپنے بھائیوں اور بہنوں کو کود کود اور ہنس ہنس کر مٹھائیاں کھاتے دیکھے۔ اور صبر کر جائے۔ مگر طرّہ یہ تھا۔ کہ وہ اُسے مٹھائیاں دکھا دکھا کر للچاتے تھے اور چڑاتے تھے۔ ان صورتوں میں غریب رمضانی اپنی آتشِ شوق کو کیونکر دباتا۔ وہ روتا تھا۔ چیختا تھا اور اپنی ماں کا آنچل

پکڑ کر دروازہ کی طرف کھینچتا تھا مگر بیچاری ماں کیا کرے۔ اُس کا کلیجہ بچے کے لئے مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اپنی بدقسمتی پر۔ اپنی بھائیوں کی بے دردی پر اور سب سے زیادہ اپنے شوہر کی نااہلی پر کڑھ کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ اپنا آدمی ایسا نکما، نالائق نہ ہوتا، تو کاہے کو دوسروں کا منہ دیکھنا پڑتا۔ کیوں دوسروں کے دھکے کھانے پڑتے

اُس نے رمضانی کو گود میں پیار سے اٹھالیا اور دلاسا دینے لگی "بیٹا! رو دو مت۔ اب کے گردن آئے گا، تو میں تمہیں بہت سی مٹھائی لے دوں گی۔ میں تمہیں اس سے بھی مٹھائیاں بازار سے منگوا دوں گی۔ تم کتنی مٹھائیاں کھاؤ گے ؟" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ پھر منگل آئے گا۔ اور پھر بھی بہانے کرنا پڑیں گے۔ افسوس! اپنا پیارا بچہ ایک پیسے کی مٹھائی کیلئے ترسے اور گھر میں کسی کا پتھر سا کلیجہ نہ پسیجے۔ وہ تو ان افسوسناک خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور رمضانی تھا کہ کسی طرح چُپ ہی نہ ہوتا تھا۔ جب کچھ بس نہ چلا تو وہ ماں کی گود سے اُتر کر زمین پر لوٹنے لگا۔ اور رو رو کر دنیا سر پر اٹھالی۔ ماں نے بہتیرا پھسلایا اور بہلایا یہاں تک کہ اُسے بچہ کی اس ضد پر غصہ آگیا۔ طبیعت انسانی کی پیچیدگیاں سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہاں تو بچے کو پیار سے گود میں چمٹاتی اور بہلاتی تھی۔ کہاں ایسی جھنجلائی۔ کہ اُسے دو تین طمانچے زور زور سے لگائے۔ اور گھڑک کر بولی :- "چُپ رہ ابھاگے، تیرا منہ مٹھائی کھانے کا ہے۔ اب رویا تو کنوئیں میں پھینک دونگی۔ اپنے نصیبوں کو نہیں روتا، مٹھائی کھانے چلا ہے"

خیراتی اپنے کوٹھڑی کے دروازہ پر بیٹھا ہوا یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا، وہ اس بچے کو بہت چاہتا تھا۔ اس وقت کے طمانچے، ایک آنچ کی طرح اس کے دل پر لگے۔ غالباً ان کا منشا یہی تھا۔ ورنہ معصوم بچے کا کیا قصور تھا۔ دُھنیا روئی کے دُھنکنے کیلئے تانت پر فریبی لگاتا ہے۔ ان باتوں نے خیراتی کے دل کو پاش پاش کر دیا۔ جس طرح پتھر اور پانی میں بھی آگ چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح نازک احساسات ہر ایک دل میں خواہ وہ کیسا ہی سیاہ اور ٹھوس کیوں نہ ہو، موجود رہتے ہیں۔ خیراتی کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ آنسو کی بوندیں اکثر انسان کی نگاہ عبرت کو کھول دیا کرتی ہیں، خیراتی کی آنکھوں سے غبار کی موٹی تہ دُھل گئی۔ اسے اپنی بے بسی اتنی صفائی سے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ بچہ ابھی تک رو رہا تھا۔ اور ماں نے اسے پھر طمانچے لگانے شروع کئے تھے۔ خیراتی نے جاکر بچہ کو گود میں اُٹھالیا۔ اور بیوی سے رقت آمیز لہجہ میں بولے: "جمیلہ! بچے پر رحم کرو۔ تمہارا گنہگار میں ہوں۔ اس وقت جو سزا چاہے دو۔ خدا نے چاہا تو کل سے اس گھر میں لوگ میری اور میرے بیوی بچوں کی قدر کریں گے، تم نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔"

❀ ❀ ❀

بیٹی کا دھن

(۱)

بیتوا ندی دو اونچے کراروں کے بیچ میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھی، جیسے بعض دلوں میں ارادہ کمزور اور تن پروری کے اندر ہمت کی مدھم لہریں چھپی رہتی ہیں۔ ایک کراڑے پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے جس کے شاندار کھنڈروں نے اسے ایک خاص شہرت دے رکھی ہے۔ قومی کارناموں پر مٹنے والے لوگ کبھی کبھی یہاں در و دیوار شکستہ کے سامنے ایک پُرخواب مایوسی کی حالت میں بیٹھے نظر آ جاتے ہیں اور گاؤں کا بوڑھا کیوٹ چودھری جب محققانہ درد و سوز کے ساتھ رانی کے محل اور راجہ کے دربار اور کنور کی بیٹھک کے مٹے ہوئے نشانات دکھاتا ہے، تو اس کی آنکھیں آبگوں ہو جاتی ہیں، جس کا سننے والوں پر ان تاریخی انکشافات سے کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے۔ کیا زمانہ تھا، کہ کیوٹوں کو مچھلیوں کے صلے

میں اشرفیاں ملتی تھیں۔ کہار لوگ محل میں جھاڑو دیتے ہوئے اشرفیاں بٹور لے جاتے تھے۔ بلتوا ندی روز بروز بڑھ کر مہاراجہ صاحب کی قدم بوسی کیلئے آتی تھی۔ یہ اقبال تھا! مہاراجہ صاحب دو مست ہاتھیوں کو ایک ایک ہاتھ سے ہٹا دیتے تھے۔ یہ سب واقعات مؤرخانہ انداز سے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اُن کی نسبت اپنی رائے قایم کرنے کی ہر شخص کو اپنی خوش اعتقادی کی نسبت سے کامل آزادی تھی۔ ہاں اگر زورِ بیان۔ اور متانت اور لب و لہجہ کسی تذکرے کو واقعیت کا رنگ دے سکتے ہیں۔ تو بوڑھے چوہدری کو اُن کے صرف کرنے میں مُطلق دریغ نہ ہوتا تھا۔

سکھو چوہدری صاحب خاندان تھے۔ مگر جتنا بڑا مُنہ تھا۔ اتنے بڑے نوالے نہ تھے۔ تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں۔ کئی پوتیاں۔ لڑکی صرف ایک تھی۔ گنگا جلی۔ جس کا ابھی تک گونا نہیں ہوا تھا۔ یہ چوہدری کی آخری اولاد تھی۔ بیوی کے مر جانے پر اس نے اُسے بکریوں کا دودھ پلا پلا کے پالا تھا۔ خاندان تو اتنا بڑا اور کھیتی صرف ایک ہل کی۔ فراغت اور تنگی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ مگر اس کی محققانہ اور مؤرخانہ قابلیت نے اُسے وہ امتیاز دے رکھا تھا۔ جس پر گاؤں کے معزز ساہوکار جھگڑ شاہ کو بھی رشک ہوتا تھا۔ جب سکھو گاؤں کے مجمع میں ضلع کے نووارد افسر(ان) سے تاریخی یادگاروں کا ذکر کرنے لگتا تھا۔ تو جھگڑ تڑپ تڑپ کے رہ جاتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ انہیں بھی ایسے موقعہ کی تلاش رہتی تھی۔ جب وہ سکھو کو نیچا دکھا سکیں ٭

(۲)

اس موضع کے زمیندار ایک ٹھاکر جتن سنگھ تھے۔ جن کی بیگار کے مارے گاؤں کے مزدور اور کسان جان سے تنگ تھے۔ امسال جب ضلع کے میجسٹریٹ کا دورہ ہوا۔ اور وہ ان آثارِ قدیمہ کی سیر کیلئے تشریف لائے تو سکھو چودھری نے دبی زبان سے اپنے گاؤں والوں کی تکلیفیں بیان کیں۔ حکام سے ہمکلام ہونے میں اُسے مطلق تامل نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا، کہ جتن سنگھ سے راز کرنا اچھا نہیں۔ مگر جب گاؤں والے کہتے، کہ چودھری تمہارے ایسے ایسے حاکموں سے ملتا ہے اور ہم لوگوں کی رات دن روتے کٹتی ہے۔ آخر یہ تمہاری دوستی کس دن کام آئیگی۔ تو سکھو کا مزاج آسمان پر جا پہنچتا۔ میجسٹریٹ نے جتن سنگھ سے اس معاملہ میں تحریری جواب طلب کیا۔

ادھر جھکڑ شاہ نے چودھری کی ان مغویانہ اور سرکشانہ زبان درازیوں کی رپورٹ جتن سنگھ کو دی۔ ٹھاکر جل کر آگ ہو گیا۔ اپنے کارندہ سے بقایا کی فہرست طلب کی۔ سوءِ اتفاق سے چودھری کے ذمہ امسال کا لگان باقی تھا۔ کچھ تو پیداوار کم ہوئی۔ اور پھر گنگاجلی کا بیاہ کرنا پڑا۔ چھوٹی بہو نتھ کیلئے رٹ لگائے ہوئے تھی۔ وہ بنوانا پڑی۔ ان مصارف نے ہاتھ بالکل خالی کر دیا۔ لگان کے بارے میں کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ جس زبان میں حکام کو خوش کرنے کی طاقت ہے کیا اس کی شیریں بیانیاں ٹھاکر پر کچھ اثر نہ کریں گی؟ بوڑھے چودھری تو اس اعتماد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ان پر بقایا لگان کی نالش ہو گئی۔ سمن آ پہنچا۔ دوسرے ہی دن پیشی کی تاریخ پڑ گئی۔ زبان کو اپنا جادو چلانیکا موقعہ نہ ملا۔

جن لوگوں کے ڑھادے سے بکھو نے ٹھاکر سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ اُن میں سے اب کسی کی صورت بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ٹھاکر کے شحنے اور پیادے گاؤں میں پھیرے لگا رہے تھے۔ ان کا خوف غالب تھا۔ کچہری یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ کنوار کے دن۔ راستہ میں جا بجا نالے اور ندیاں حائل۔ کچا راستہ۔ بیل گاڑی کا گزر نہیں۔ پیروں میں سکت نہیں۔ آخر عدم پیروی میں یکطرفہ فیصلہ ہو گیا۔ ٹوٹے دلوں کی وکالت کرنا دلدل میں پیر رکھنے سے کم نہیں۔

(۳)

قرقی کا نوٹس پہنچا۔ تو چودھری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنی کمزوری کا علم اوسان کا دشمن ہے۔ شیریں بیان بکھو جس کی روشنی طبع اُس کے سر پر یہ آفت لائی تھی۔ اس وقت بچہ بے زبان بنا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا ناندی کی طرف تاکتا اور دل میں سوچتا تھا۔ کیا میرے جیتے جی گھر مٹی میں مل جائیگا۔ یہ میرے بیلوں کی خوبصورت گوئیں۔ کیا ان کی گردن میں دوسروں کا جوا پڑے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ بیلوں سے لپٹ کر رونے لگتا۔ مگر بیلوں کی آنکھوں سے کیوں آنسو جاری تھے۔ وہ کیوں ناند میں منہ نہیں ڈالتے تھے؟ کیا جذبۂ درد میں وہ بھی اپنے آقا کے شریک تھے؟

پھر وہ اپنے جھونپڑے کو مایوس نگاہوں سے دیکھتا۔ کیا ہم کو اس گھر سے نکلنا پڑیگا۔ یہ بزرگوں کی نشانی میرے جیتے جی مٹ جائیگی؟

بعض طبیعتیں آزمائش میں مضبوط رہتی ہیں۔ بعض اُس کا ایک جھونکا

بھی نہیں سہہ سکیتں۔ چوہدری کی طبعی ذہانت نے اب موزونیٔ طبع کی صورت
اختیار کی، جو تک بندی سے بہت مشابہ تھی۔ اپنی کھاٹ پر پڑے وہ
گھنٹوں دیوتاؤں کو یاد کیا کرتا۔ اور مہابیر اور دیو کے گن گاتا،

اسمیں کوئی شک نہیں۔ کہ اس کی تینوں بہوؤں کے پاس زیور تھے،
مگر عورت کا زیور اُدھ کا دس ہے۔ جو بیلنے سے ہی نکلتا ہے۔ چوہدری
ذات کا ہیٹیا ہو۔ مگر طبیعت کا شریف تھا۔ ناموران سلف کا ذکر خیر کرتے
کرتے اس کی طبیعت بھی نیکو دہ ہو گئی تھی، وہ اپنی طرف سے کبھی بہوؤں سے
اس قسم کا تقاضا نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہ صورت اس کے خیال ہی میں نہ آئی
تھی، ہاں تینوں بیٹے اگر معاملہ فہمی سے کام لیتے تو بوڑھے چوہدری کو دیوتاؤں
کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی، مگر بڑے مہاجزادے کو گھاٹ سے فرصت نہ تھی،
اور باقی دو لڑکے اس عقدہ کو مردانہ اور دلیرانہ طریق پر حل کرنے کی فکر میں مدہوش
تھے۔ کاش جیتن سنگھ اس وقت انہیں کہیں اکیلے مل جاتے!

منجھلے جھینگر نے کہا۔ اُدھم اس گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ جہاں کمائیں
گے، وہاں کھائیں گے۔ مگر جیتن سنگھ کی مونچھیں ایک ایک کر کے چن لوں گا،
چھوٹے بھکڑ انیڈ کر بولے۔ مونچھیں تم چن لینا ناک میں اُڑا دونگا،
نکٹا بنا گھومے گا۔ اس پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور مچھلی مارنے کے لئے
ندی کی طرف چل دیئے،

(۴)

اس گاؤں میں ایک بوڑھے برہمن بھی رہتے تھے۔ مندر میں پوجا کرتے

تھے۔ روزانہ اپنے ججمانوں کو درشن دینے کیلئے ندی پار جاتے۔ مگر کھیرے کے پیسے نہ دیتے۔ تیسرے دن وہ زمیندار کے گوئیدوں کی نظر بچا کر سکھو کے پاس آئے اور رازدارانہ انداز سے بولے۔ چوہدری کل ہی تک میعاد ہے۔ اور تم ابھی تک پڑے سو رہے ہو۔ کیوں نہیں گھر کی چیز۔ بستو، ڈھور ڈنگر کہیں اور ہانک دیتے ہو۔ سمدھیانے بھیج دو۔ جو کچھ بچ رہے وہی سہی گھر کی مٹی کھود کر کوئی تھوڑے ہی لے جائے گا۔

چوہدری اُٹھ بیٹھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر تقدس کی شان سے بولا۔ جو کچھ اس کا حکم ہے، وہ ہوگا۔ مجھ سے یہ حال نہ کیا جائیگا۔

کئی دن کی متواتر شب و روز کی عقیدتمندانہ درد بھری دعاخوانی نے جن میں نمائش کا شائبہ نہ تھا۔ اسے مدافعت کی اس عملی اور عام تجویز پر کاربند ہونے دیا۔ پنڈت جی جو اس فن کے استاد تھے۔ نادم ہو گئے مگر چوہدری کے گھر کے دوسرے ممبر خدا کی مرضی پر اس حد تک شاکر نہ تھے۔ گھر کے برتن بھانڈے چپکے چپکے کھسکائے جاتے تھے۔ اناج کا ایک دانہ بھی گھر میں نہ رہنے پایا۔ رات کو کشتی لدی ہوئی جاتی۔ اور خالی واپس آتی۔ تین دن تک گھر میں چولہا نہ جلا۔ بوڑھے چوہدری کے منہ میں دانہ کا کیا ذکر پانی کی ایک بوند بھی نہ پڑی تھی۔ عورتیں بھاڑ سے چنے بھنا بھنا کر کھاتیں۔ لڑکے ندی سے مچھلیاں لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔ اگر اس فاقہ کشی میں کوئی بوڑھے کا شریک تھا۔ تو وہ اس کی لڑکی گنگا جلی تھی۔ وہ غریب اپنے باپ کو چارپائی پر بے آب و دانہ پڑے کراہتے دیکھتی اور بلک

بلکہ کر دیتی۔ قدرت نے دیگر جذبات کی طرح عورتوں کو محبت بھی زیادہ دی ہے۔ لڑکوں کو والدین سے وہ محبت نہیں ہوتی۔ جو لڑکیوں کو ہوتی ہے۔ اور گنگا جلی کے آنسوؤں میں اُلفت کا خالص جذبہ تھا۔ مادی مآل اندیشیوں سے پاک!

گنگا جلی اس فکر میں غوطے کھایا کرتی۔ کہ کیسے دادا کی مدد کی جائے۔ اگر ہم سب بھائی بہن مل کر جتن سنگھ کے پاس جائیں۔ اور ان کے پیروں پر سر رکھ دیں، تو کیا وہ نہ مانیں گے۔ مگر دادا سے یہ کب دیکھا جائیگا۔ ایسے وہ ایک دن بڑے صاحب کے پاس چلے جاتے تو سب کچھ بن جاتا۔ مگر ان کی تو جیسے بدھ ہی کیا ہو گئی۔ اسی اُدھیڑ بُن میں اُسے اندھیرے میں روشنی کی ایک جھلک نظر آتی۔

(۵)

پجاری جی سُکھو چوہدری کے پاس سے چلے گئے تھے۔ اور چوہدری بڑی بلند آواز سے اپنے سوتے ہوئے کہا یر اور بھگوان اور منوہان کو بلاتے تھے۔ کہ گنگا جلی اُن کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ چوہدری نے دیکھا، اور بولے "کیا ہے بیٹی؟ رات کو کیوں باہر آئیں؟"

گنگا جلی نے کہا:" باہر رہنا تو بھاگ ہی میں لکھا ہے۔ گھر میں کیسے رہوں؟"
سُکھو نے زور سے ہانک لگائی۔" کہاں گئے تم کرشن مُراری میرے دکھ ہرو۔"

گنگا جلی بیٹھ گئی۔ اور آہستہ سے بولی:" بھجن گاتے۔ تو تین دن ہو گئے

گھر بار بچانے کی بھی کوئی اُپائے سوچی، کہ یہ سب مٹی میں ملا دو گے، کیا ہم لوگوں کو پیڑ تلے رکھو گے؟"

چودھری نے پُرنم انداز سے کہا: "بیٹی! مجھے تو کوئی اُپائے نہیں سوجھتی بھگوان جو چاہیں گے ہوگا۔ بیگ چلو گردھر گوپالا کا ہے بلمب کرو۔"

گنگا جلی بولی: "میں نے ایک اُپائے سوچی ہے۔ کہو تو بتاؤں۔"

چودھری اُٹھکر بیٹھ گیا، قالب بے جان میں جان سی پڑ گئی۔ پوچھا: "کون سی اُپائے ہے بیٹی؟"

گنگا جلی نے کہا: "میرے گہنے جھگڑ ساہو کار کے یہاں گرو رکھ دو، میں نے سمجھ لیا ہے۔ دینے بھر کے روپے ہو جائیں گے۔"

چودھری نے آہ سرد بھری اور بولے: "بیٹی تم کو مجھ سے یہ کہتے لاج نہیں آتی۔ بید شاستر میں مجھے تمہارے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینا بھی نہیں لکھا ہے۔ تمہاری ڈیوڑھی میں پیر رکھنا بھی منع ہے۔ کیا مجھے نرگ میں دھکیلنا چاہتی ہو؟"

گنگا جلی اس جواب کے لئے پہلے سے ہی تیار تھی۔ بولی "میں تمہیں اپنے گہنے دیئے تھوڑے ہی دیتی ہوں۔ اس وقت لیکر کام چلاؤ۔ چیت میں چھڑا دینا۔"

چودھری نے زور دیکر کہا: "یہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

گنگا جلی نے بھی پُرجوش انداز سے جواب دیا: "تم سے نہ ہو گا۔ تو میں آپ جاؤنگی۔ مجھ سے گھر کی یہ دشا دیکھی نہیں جاتی۔"

چودھری جھنجھلا کر بولے۔ "برادری میں کس طرح منہ دکھاؤں گا؟"

گنگا جلی نے چڑ کر کہا۔ "برادری میں کون ڈھنڈورہ پیٹنے جائیگا؟"

چودھری نے فیصلہ کیا۔ "جگ ہنسائی کیلئے میں اپنا دھرم نہ بگاڑوں گا۔"

گنگا جلی نے دھمکایا۔ "میری بات نہ مانو گے تو تمہارے اوپر میری ہتیا پڑیگی۔ میں آج ہی اس بتیوا ندی میں کود پڑونگی۔ تم سے چاہے گھر میں آگ لگتے دیکھا جائے۔ مجھ سے نہ دیکھا جائیگا۔"

چودھری نے پھر ایک سانس بھری اور بیچارانہ انداز سے بولے۔ "بیٹی میرا دھرم نہ ستیاناس کرو۔ اگر ایسا ہی ہے تو اپنی کسی بھاوج کے گہنے مانگ لاؤ۔"

گنگا جلی نے طنز کے ساتھ کہا۔ "بھاوجوں سے اپنا منہ کون نچوائے اُن کو فکر ہوتی تو کیا منہ میں دہی جما تھا۔ کہتیں نہ؟"

چودھری لاجواب ہو گئے۔ گنگا جلی کی دلیلوں کے مقابلہ میں اُس کے انداز کی سرگرمی نے زیادہ اثر کیا اور یہی تدبیر اس وقت چودھری کی دماغی حالت کے لئے موزوں تھی۔ جس کے عملی اوصاف زائل ہو چکے تھے۔ وہ اپنی منوا نہ سکتا تھا۔ صرف دوسرے کی مان سکتا تھا۔ آگے آگے نہیں صرف پیچھے پیچھے چل سکتا تھا۔

گنگا جلی گھر میں گئی۔ اور گہنوں کی پٹاری لے آئی۔ اور انہیں نکال کر چودھری کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ چودھری نے کہا۔ "ہائے رام! اس مٹی کی کیا گت کروگے"۔ یہ کہکر اُٹھے۔ مگر پوٹلی ہاتھ میں لیتے ہی باوجود بہت

ضبط کرنے کے اُن کے آنسو اُمڈ آئے۔ اور دبی ہوئی سسکیاں ایک بار زور سے پھوٹ نکلیں۔

(۶)

رات کا وقت۔ بتیہ اندی کے کراڑے پر سکھو چودھری گہنوں کی پوٹلی بغل میں دبائے اس طرح سب کی نظریں بچاتے چلے جاتے تھے۔ گویا یہ پاپ کی گٹھڑی ہے۔ جب وہ جھگڑو شاہ کے مکان کے قریب پہنچے تو ذرا رک گئے۔ آنکھیں خوب اچھی طرح صاف کیں۔ اور بشاشت کا روپ بھرا۔ کسی کو اپنے حاسد اور بدخواہ کے سامنے بیکسی کا اظہار کرنے کی نوبت نہ آئے! زندگی میں اس سے زیادہ المناک اور کوئی حادثہ نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی ضرورت آ ہی پڑے تو پھر جذبات پہ ایک خوب موٹا پردہ ڈالنا چاہیئے۔

جھگڑو شاہ دھاگے کی کمانیوں والی ایک عینک لگائے کچھ بہی کھاتے سامنے پھیلائے ناریل پیتے تھے۔ اور چراغ کی دھندلی روشنی میں ان حروف کو پڑھنے کی کوشش بےسود کرتے تھے۔ جن میں سیاہی کا بہت کفایت شعارانہ استعمال کیا گیا تھا۔ بار بار عینک کو صاف کرتے اور آنکھیں ملتے تھے۔ مگر چراغ کی بتی کو اُکسانا یا دوہرانا مناسب نہ خیال کرتے تھے۔ اتنے میں سکھو چودھری نے کہا۔ "جے رام جی کی"۔

جھگڑو نے عینکوں کی آڑ سے دیکھا۔ آواز پہچانی۔ بولے۔ "جے رام جی کی چودھری! کہو اس معاملہ میں کیا ہوا۔ یہ لین دین بڑا پاجی کام ہے۔ دن بھر سر اُٹھانے کی چھٹی نہیں ملتی"۔

چوہدری نے پوٹلی کو رانوں تلے چھپا کر لاپروائی کے انداز سے کہا۔ "ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ کل اجرائے ڈگری ہونیوالی ہے۔ ٹھاکر صاحب نے جانے کب کی نیز نکالی؟ اگر ہم کو دو، تین دن کی بھی مہلت ملتی۔ تو ڈگری نہ جاری ہونے پاتی۔ رجنٹ صاحب اور بڑے صاحب دونوں ہم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی اسی سال میں نے اُن سے ندی کنارے گھنٹوں باتیں کیں۔ مگر ایک تو برسات کے دن دوسرے ایک دن کی بھی مہلت نہیں۔ کیا کرتا۔ مجھے اس وقت روپیوں کی فکر ہے۔"

جھبرو شاہ نے تعجب انگیز لہجہ میں کہا۔ "تم کو روپیوں کی فکر؟ گھر میں بھرا ہوا ہے۔ وہ کس دن کام آئے گا؟"

جھبرو شاہ نے یہ بات طنزاً نہیں کہی تھی۔ انہیں اور سارے گاؤں کو اس بات کا یقین کامل تھا۔ ہمارے پڑوسیوں کو دنیا میں کسی اور بات کا اتنی جلدی یقین نہیں ہوتا۔ جتنا ہماری خوشحالی کا۔

چوہدری کا بہروپ کھلنے لگا۔ بولے۔ "شاہ جی روپے ہوتے تو چنتا کس بات کی تھی۔ تم سے پردہ کونسا ہے۔ تین دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ سارے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ اب تو تمہارے لبائے بسوں گا۔ ٹھاکر نے تو اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی؟"

جھبرو شاہ جتن سنگھ کو خوش ضرور رکھنا چاہتے تھے۔ مگر چوہدری کی حکام رسی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اصل معہ سود مرکب آسانی سے وصول ہو جائے۔ تو انہیں چوہدری کو زیر بار احسان کرنے میں کوئی تامل

نہیں تھا۔ کیا عجب ہے۔ اسی شخص کی چرب زبانیوں کی بدولت انکم ٹیکس سے نجات ہو جائے۔ جو باوجود اخفائے آمدنی کی متعدد کوششوں کے ان کی توند کی طرح روز بروز مائل بہ افراوانی تھی۔ بولے "کیا کہیں چودھری! خرچ سے ہم بھی آجکل تنگ ہیں۔ لہنے وصول نہیں ہوئے۔ ٹیکس کا روپیہ دینا پڑا۔ تمہیں کتنا روپیہ درکار ہوگا؟"

چودھری نے کہا "ڈیڑھ سو روپے کی ڈگری ہے۔ خرچ برچ ملا کر دو سو کے لگ بھگ سمجھو۔"

جھگڑ اب اپنے داؤں کھیلنے لگا۔ پوچھا "تمہارے لڑکوں نے کچھ بھی مدد نہ کی؟ وہ سب بھی تو کچھ نہ کچھ کماتے ہی ہیں۔"

ساہوکار کا یہ نشانہ ٹھیک پڑا۔ لڑکوں کی لاپروائی سے چودھری کے کے دل میں جو بخارات جمع تھے۔ وہ ابل پڑے۔ بولے "بھائی اگر لڑکے کبھی لائق ہوتے تو یہ دن ہی کیوں آتا۔ انہیں تو اپنے چین آرام سے مطلب ہے۔ گرہستی کا بوجھ میرے سر ہے۔ میں اسے جیسے چاہوں سنبھالوں۔ ان سے کچھ سروکار نہیں۔ مرتے دم بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ مروں گا۔ تو سب کھال میں بھس بھروا کے رکھ چھوڑیں گے۔ یہ گرہستی نہیں ہے۔ جنجال ہے۔"

جھگڑ نے دوسرا تیر مارا۔ اور وہ بھی کاری پڑا۔ "کیا بہوؤں سے بھی کچھ نہ بن پڑا؟"

چودھری نے جواب دیا "بہو بیٹے سب اپنی اپنی فکر میں مست ہیں۔ میں تین دن دوارے پر بے دانہ پانی پڑا رہا۔ کسی نے بات نہ پوچھی۔ کہاں

کی صلاح، کہاں کی بات چیت۔ بھوؤں کے پاس روپیے نہ ہوں، مگر گہنے تو ہیں، اور میرے ہی منواتے ہوئے۔ اس آڑے پر دو۔ دو تھان اتار دیتیں تو کیا میں جھگڑا نہ دیتا۔ دن سدا یوں ہی تھوڑے ہی رہیں گے۔"

جھبکرتا سمجھ گئے کہ یہ محض زبان کا سودا ہے۔ اور زبان کے سودے وہ بھول کر بھی نہ کرتے تھے۔ بولے "تمہارے گھر کے آدمی بھی انوکھے ہیں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ بڈھا روپیے کہاں سے لائے گا۔ زمانہ اور طرح کا ہے، یا تو کچھ جائیداد دیکھو۔ یا پھر گہنے پاتے ہوں۔ اس کے بغیر روپیہ کہاں۔ اسمیں بھی جائیداد میں سینکڑوں بکھیڑے ہیں۔ سبھیتا اسی گرو رکھنے میں ہوتا ہے۔ ہاں جب گھر والوں کی یہی مت ہے۔ تو تم کیوں حیران ہوتے ہو۔ یہی ہوگا نہ، بدنامی ہوگی۔ لوگ ہنسیں گے۔ مگر اس لاج کو کہاں تک نباہو گے؟"

چودھری نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ "جھبکرتا یہی لاج ہی تو ہے۔ جو مارے ڈالتی ہے۔ تم سے کیا چھپا ہے۔ ہمارے دادا بابا مہراج کی سواری کے ساتھ چلتے تھے۔ اور اب آج یہ دن آگیا ہے۔ کہ گھر کی دیواریں تک بکی جاتی ہیں۔ کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ یہ دیکھو! گہنوں کی پوٹلی ہے۔ یہ لاج نہ ہوتی۔ تو میں اسے لیکر کبھی نہ آتا۔ مگر یہ ادھرم اسی لاج نباہنے کیلئے سر پر لیا ہے۔"

جھبکرتا نے تعجب سے پوچھا! "یہ گہنے کس کے ہیں؟"

چودھری نے سر جھکاکر بڑی مشکل سے کہا۔ "میری بیٹی گنگا جلی کے۔"

جھبکرتا نے دلسوزی کے ساتھ کہا۔ "ارے رام رام!"

چودھری بولے، "ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے"۔
جھگڑو نے کہا۔ "شاستروں میں بیٹی کے گاؤں کا روکھ تک دیکھنا منع ہے"۔

چودھری نے اپنی معذوری جتائی۔ نہ جانے ناراین کب موت دیں گے۔ تین لڑکیاں بیاہیں۔ کبھی ان کے دروازے کی صورت نہیں دیکھی۔ پرماتما نے ابتک تو ٹیک نباہی ہے۔ مگر اب نہ جانے مٹی کی کیا دُردشا ہونے والی ہے۔
جھگڑو شاہ لیکھا جوکھو اور بخشش سُوسُو کے ذریں اصُول کے پابند تھے۔ سُود کی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اگر مہینہ کا ایک دِن بھی لگ جائے۔ تو پورے مہینے کا سُود وصُول کر لیتے۔ مگر نوراتر کے دِنوں میں روزانہ برہمنوں کو سیدھے بانٹتے۔ مذہبی عقیدت اور مذہبی فیاضی ہمارے ساہوکاروں کا زیور ہے۔ جھگڑو کے دروازہ پر سال میں ایک بار بھاگوت ضرور ہوتی۔ کوئی غریب براہمن لڑکی کے بیاہ کے لئے ان کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ اُسے مایوسی نہ ہوتی تھی۔ برہمن کتنا ہی موٹا تازہ کیوں نہ ہو۔ اُسے اُن کے دروازے پر مہذب نفرین اور پھٹکار نہیں سُننا پڑتی تھی۔ ان کے مذہب میں بیٹی کے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینے کے مقابلہ میں پیاس سے مر جانا بدرجہا بہتر تھا۔ اور وُہ خود اِس اصُول کے سختی سے پابند تھے۔ اور اس پابندی کی قدر کرتے تھے۔ انہیں اس وقت چودھری پر رحم آیا۔ یہ شخص جس نے کبھی اوچھے خیالوں کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اس وقت زمانہ کی کشمکش سے مجبوُر ہو کر ادھرم پر اُتر آیا ہے۔ اس کے

دھرم کی رکھشا کرنی چاہیئے۔ یہ خیال آتے ہی جھگڑو شاہ گدی سے اُٹھ بیٹھے اور تسکین بخش انداز سے بولے۔ "وہی پرماتما جس نے اب تک یہ ٹیک نبھائی ہے۔ اب بھی تمہارا پرن نبھائے گا۔ لڑکی کے گہنے لڑکی کو دے دو۔ لڑکی جیسی تمہاری ہے۔ ویسی میری۔ میں ڈگری کے کل روپے تمہیں دیدوں گا۔ جب ہاتھ میں روپے آجائیں تو دے دینا۔ مجھے لوگ جتنا بُرا کہتے ہیں۔ اتنا بُرا نہیں ہوں۔ ہاں اپنا پیسہ پانی میں نہیں بہاتا۔"

چودھری پر اس فیاضانہ ہمدردی کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ وہ باآواز بلند رونے لگے۔ انہیں اپنی بھگتی کی دھن میں اس وقت کرشن بھگوان کی موہنی مورت سامنے کھڑی نظر آئی۔ وہ جھگڑو جو تمام گاؤں میں بدنام تھا۔ جسکی اُس نے بارہا حاکموں سے شکائیت کی تھی۔ اس وقت چودھری کو ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ بولے۔ "جھگڑو! تم نے اس وقت میری بات۔ میری لاج۔ میرا دھرم سب کچھ رکھ لیا۔ تم نے میری ڈوبتی ہوئی ناؤ پار لگادی۔ کرشن مُرادی تم کو اس جس کا پھل دیں گے۔ اور میں تو جب تک جیوں گا۔ تمہارے گُن گاتا رہوں گا۔"

  

آہِ بے کس

(۱)

منشی رام سیوک بھویں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے اور بولے "ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔"

موت کی دست درازی کا زمانہ شاکی ہے۔ اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا۔ مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتی ہیں، انہیں قبول کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ اگر اسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاندپور کے ایک ممتاز رئیس تھے اور رؤسا کے اوصافِ حمیدہ سے بہرہ ور۔ وسیلۂ معاش اتنا ہی وسیع تھا، جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں۔ یہی ان کی املاک اور موروثی جائداد تھی۔ وہ روز عدالت منصفی کے احاطے میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظر آتے تھے، اور گو انہیں کسی نے کسی اجلاس پر قانونی بحث یا مقدمے

پیروی کرتے نہیں دیکھا مگر عرفِ عام میں وہ مختار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے
پانی برسے۔ اولے گریں مگر مختار صاحب کسی نامراد دل کی طرح وہیں جمے رہتے
تھے۔ وہ کچہری چلتے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا۔ چاروں طرف سے ان
عقیدت اور احترام کی نگاہیں پڑتیں۔ اور اطراف میں مشہور تھا کہ ان کی زبان پر
سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختار کاری۔ مگر یہ صرف خاندانی اور اعزازی پیشہ
تھا۔ آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں۔ نقرئی سکوں کا تو ذکر ہی کیا کبھی کبھی مسی
سکے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں کوئی شک نہیں۔ مگر "پاس" کی منحوس قید نے
انہیں مجبور و معذور کر دیا تھا۔ بہرحال جو کچھ ہو۔ یہ پیشہ محض اعزاز کے لئے
تھا۔ ورنہ ان کی گزران کی خاص صورت قرب و جوار کی بے کس مگر فارغ البال
بیواؤں اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ
ان کی امانت میں رکھتیں۔ بوڑھے اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دستبرد سے
محفوظ رکھنے کیلئے انہیں سونپتے۔ اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی میں جاکر
پھر نکلنا نہیں جانتا تھا۔ وہ حسب ضرورت کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے۔ بلا قرض
لئے کس کا کام چل سکتا ہے؟ صبح کو شام کے وعدے پر روپیہ لیتے مگر وہ شام
کبھی نہیں آتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ منشی جی قرض لے کر دینا نہیں جانتے تھے۔ اور یہ
ان کا خاندانی وصف تھا۔ اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔

یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے تھے۔ قانون اور عدالت

گا انہیں کوئی خوف نہیں تھا۔ اس میدان میں ان کا سامنا کرنا پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا تھا۔ لیکن جب بعض شریر النفس لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہو جاتے۔ اُن کی خوش نیتی پر شک کرتے اور اُن کے دُور و علانیہ بد زبانیوں پر اُتر آتے۔ تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا۔ اس قسم کے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر جگہ ایسے تنگ ظرف حضرات موجود ہوتے ہیں۔ جنہیں دوسروں کی تحقیر میں مزہ آتا ہے۔ انہیں بدخواہوں کی شہ پاکر بعض اوقات چھوٹے چھوٹے آدمی منشی جی کے مُنہ آجاتے تھے۔ ورنہ ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ان کے گھر میں جاکر انہیں کی شان میں نازیبا کلمات مُنہ سے نکالے۔ منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے۔ برسوں تک اس سے سبزی لی تھی۔ اگر دام نہ دیئے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہیئے تھا۔ جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بدزبان عورت دو سال ہی میں گھبرا گئی۔ اور چند آنے پیسوں کے لئے ایک معزز آدمی کی آبرو ریزی کی۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے جھنجلا کر موت کو دعوت دی۔ تو اُن کی کوئی خطا نہیں۔

(۲)

اسی موضع میں مونگا نام ایک بیوہ برہمنی تھی۔ اُس کا شوہر برما کی کالی پلٹن میں حوالدار تھا۔ اور وہیں مارا گیا تھا۔ اُس کے حسن خدمات کے صلے میں مونگا کو پانسو روپے ملے تھے۔ بیوہ تھی۔ زمانہ نازک۔ اس نے یہ روپے منشی رام سیوک کو سونپ دیئے اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لیکر گذر کرتی رہی منشی جی نے یہ فرض کئی سال تک نیک نیتی کے ساتھ پورا کیا۔ مگر جب پیرانہ

سالی کے باوجود مونگا نے مرنے میں تامل کیا۔ اور منشی جی کو اندیشہ ہوا۔ کہ شائد وہ توشۂ آخرت کیلئے نصف رقم بھی چھوڑنا نہیں چاہتی۔ تو ایک روز انہوں نے کہا۔" مونگا! تمہیں مرنا ہے یا نہیں۔ صاف صاف کہہ دو۔ تاکہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں۔"

اس دن مونگا کی آنکھیں کھُلیں۔ خواب سے بیدار ہوئی۔ بولی۔" میرا حساب کردو۔" فردِ حساب تیار تھی۔ امانت میں اب ایک کوڑی بھی باقی نہ تھی۔ اس ہنر گیری سے جو بڑھاپے کیساتھ مخصوص ہے۔ اس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔" میرے پورے سو روپے تم نے دبائے ہیں۔ میں ایک ایک کوڑی لے لوں گی۔"

مگر بے کسوں کا غصّہ پٹاخے کی آواز ہے۔ جس سے بچے ڈر جاتے ہیں۔ اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔ عدالت میں اس کا کچھ زور نہ تھا۔ نہ کوئی لکھا پڑھی۔ نہ حساب کتاب۔ البتّہ پنچائت سے کچھ اُمید تھی۔ اور پنچائت بیٹھی گاؤں کے آدمی جمع ہوئے منشی جی نیت اور معاملے کے صاف تھے۔ انہیں پنچوں کا کیا خوف۔ سبھا میں کھڑے ہو کر پنچوں سے کہا۔" بھائیو! آپ سب لوگ ایماندار اور شریف ہیں۔ میں آپ سب صاحبوں کا خاک پا اور پروردہ ہوں۔ آپ صاحبوں کی عنایات والطاف سے فیض وکرم سے۔ محبّت وشفقت سے۔ میرا ایک ایک رونگٹا گراں بار ہے۔ کیا آپ سب نیک اور شریف حضرات خیال کرتے ہیں۔ کہ میں نے ایک بے کس اور بیوہ عورت کے روپے ہضم کر لیے؟"

پنچوں نے یک زبان ہو کر کہا "نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا"!
اگر آپ سب نیک اور شریف صاحبوں کا خیال ہے۔ کہ میں نے
روپے دبا لئے۔ تو میرے لئے ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں میں
امیر نہیں ہوں نہ مجھے فیاضی کا دعوےٰ ہے۔ مگر اپنے قلم کی بدولت۔ آپ
صاحبوں کی عنایت کی بدولت کسی کا محتاج نہیں۔ کیا میں ایسا کمینہ ہو جاؤں
گا۔ کہ ایک بے کس عورت کے روپے ہضم کر لوں!"
پنچوں نے یک زبان ہو کر پھر کہا "نہیں۔ نہیں۔ آپ سے ایسا نہیں ہو
سکتا"

پگڑی کی نگری ہے۔ پنچوں نے منشی جی کو رہا کر دیا۔ پنچایت ختم
ہو گئی۔ اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین ہو سکتی تھی۔ تو وہ یہ تھا۔
کہ یہاں نہ دیا۔ نہ سہی۔ وہاں کہاں جائے گا!

(۴)

مونگا کا اب کوئی غمخوار و مددگار نہ تھا۔ ناداری سے جو کچھ تکلیفیں
ہو سکتی ہیں۔ وہ سب اُسے جھیلنی پڑیں۔ اس کے قوے درست تھے۔
وہ چاہتی تو محنت کر سکتی تھی۔ مگر جس دن پنچایت ختم ہوئی۔ اسی دن
اُس نے کام کرنے کی قسم کھا لی۔ اب اُسے رات دن روپوں کی رٹ لگی ہوئی
تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے اسے صرف ایک کام تھا۔ اور وہ
منشی رام سیوک کا ذکر خیر تھا۔ اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی وہ رات
دن انہیں صادق دل سے دعائیں دیا کرتی اور اکثر دعاؤں میں ایسے شاعرانہ

تلانے۔ ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سُن کر حیرت ہوتی تھی۔
رفتہ رفتہ موہنگا کے حواس پر وحشت کا غلبہ ہوا۔ ننگے سر ننگے بدن
ہاتھ میں ایک کلہاڑا لئے وہ سنسان جنگلوں میں جا بیٹھتی۔ جھونپڑے کے بجائے
اب وہ مرگھٹ پر ندی کے کنارے کھنڈروں میں گھومتی دکھائی دیتی بکھری
ہوئی پریشان لٹیں۔ سُرخ آنکھیں۔ وحشت ناک چہرہ سوکھے ہوئے ہاتھ
پاؤں۔ اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے۔ اب اسے کوئی
مزاح کے طور پر نہ چھیڑتا۔ اگر وہ کبھی گاؤں میں نکل آتی۔ تو عورتیں گھروں
کے کواڑ بند کر لیتیں۔ مرد کترا کر نکل جاتے اور بچے چیخ چیخ کر بھاگ
جاتے۔ اگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا۔ تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ رام غلام
تھا۔ باپ میں جو کچھ کور کسر رہ گئی تھی۔ وہ اُن کی ذات میں پوری ہو گئی
تھی۔ لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ گاؤں کے کانے اور لنگڑے
آدمی اُس کی صورت سے بیزار تھے۔ اور گالیاں کھانے میں تو شاید سسرال
میں آنے والے داماد کو بھی اتنا مزہ نہ آتا ہو۔ وہ موہنگا کے پیچھے تالیاں بجاتا
کتوں کو ساتھ لئے اس وقت تک رہتا۔ جب تک وہ غریب تنگ آکر نکل
نہ جاتی۔ روپیہ پیسہ، ہوش وحواس کھو کر اسے پگلی کا لقب ملا۔ اور وہ
سچ مچ پگلی تھی۔ اکیلے بیٹھے ہوئے آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کیا کرتی
جن میں رام سیوک کے گوشت، ہڈی، پوست، آنکھیں، کلیجہ وغیرہ
کو کھانے، مسلنے، نوچنے، کھسوٹنے کی پُرجوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ اور
جب یہ خواہش بیتابی کی حد تک پہنچ جاتی تو وہ رام سیوک کے مکان کی طرف

منہ کر کے بلند اور ڈراؤنی آواز سے ہانک لگاتی "تیرا لہو پیئیں گی"۔
اکثر راتوں کے سناٹے میں یہ گرجتی ہوئی آواز سن کر عورتیں چونک پڑتی تھیں، مگر اس آواز سے زیادہ ہیبت ناک اس کا قہقہہ تھا۔ منشی جی کے خیالی لہو پینے کی خوشی میں وہ زور سے ہنسا کرتی تھی۔ اس قہقہے سے ایسی شیطانی مسرت، ایسی سفاکی، ایسی خونخواری ٹپکتی تھی۔ کہ رات کو سن کر لوگوں کے خون سرد ہو جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سینکڑوں الو ایک ساتھ ہنس رہے ہیں۔
منشی رام سیوک بڑے حوصلہ و جگر کے آدمی تھے۔ نہ انہیں دیوانی کا خوف تھا نہ فوجداری کا۔ مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سن کر وہ بھی سہم جاتے تھے۔ ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو، اور اکثر اوقات نہیں ہوتا، مگر خدائی انصاف کا خوف ہر انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات پیش آ جاتے ہیں، جب نفس کے نیچے دبا ہوا یہ خیال اوپر آ جاتا ہے۔ مونگا کی وحشت ناک شب گردی رام سیوک کے لیئے یہی مبارک اتفاق تھی۔ اور ان سے زیادہ ان کی بیوی کیلیئے جو ایک وفادار عورت کی طرح ہر معاملے میں نہ صرف اپنے شوہر کا ساتھ دیتی تھیں۔ بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتی تھیں۔ فرقۂ اناث میں ان کے زور بیان کا عام شہرہ تھا۔ زبانی معاملات ہمیشہ وہی طے کیا کرتی تھیں۔ اُن لوگوں کو بھول تھی جو کہتے تھے کہ منشی جی کی زبان پر سرسوتی ہے۔ یہ فیض ان کی بیوی کو حاصل تھا۔ زور بیان

میں ان کو وہی ملکہ تھا جو منشی جی کو زورِ تحریر میں۔ اور یہ دونوں پاک روحیں اکثر عالمِ مجبوری میں مشورہ کرتیں۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

(۴)

آدھی رات کا وقت تھا منشی جی حسبِ معمول غم غلط کرنے کے لئے آبِ آتشیں کے چار گھونٹ پی کر سو گئے تھے۔ یکایک مونگا نے ان کے دروازے پر آ کر زور سے ہانک لگائی "تیرا لہو پیوں گی"۔ اور خوب کھلکھلا کر ہنسی۔

منشی جی یہ خوفناک قہقہہ سن کر چونک پڑے۔ خوف سے پاؤں تھرتھرا رہے تھے اور کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ دل پر بہت جبر کر کے انہوں نے دروازہ کھولا۔ اور جا کر ناگن کو جگایا۔

ناگن نے جھلّا کر کہا۔ "کیا ہے؟ کیا کہتے ہو؟"

منشی جی نے آواز دبا کر کہا۔ "وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہے۔"

ناگن اٹھ بیٹھی۔ "کیا کہتی ہے؟"

"تمہارا سر"

"کیا دروازے پر آ گئی؟"

"ہاں! آواز نہیں سنتی ہو؟"

ناگن مونگا سے نہیں۔ مگر اس کی وحشت سے ڈرتی تھی۔ تاہم اسے یقین تھا۔ کہ میں تقریر میں اسے ضرور نیچا دکھا سکتی ہوں۔ سنبھل کر بولی۔ "تو میں اس سے دو باتیں کر لوں"۔ مگر منشی جی نے منع کیا۔

دونوں آدمی دہلیز پر گئے اور دروازے سے جھانک کر دیکھا، مونگا کی ڈھنالی مورت زمین پر پڑی تھی۔ اور اُس کی سانس تیزی سے چلتی سنائی دیتی تھی۔ رام سیوک کے خون اور گوشت کی آرزو میں وہ اپنا خون اور گوشت خشک کر چکی تھی۔ ایک بچہ بھی اُسے گرا سکتا تھا۔ مگر اُس سے سارا گاؤں ڈرتا تھا۔ ہم زندہ انسانوں سے نہیں ڈرتے ہیں، مُردوں سے ڈرتے ہیں۔

اگرچہ اندر سے دروازہ بند تھا، مگر منشی جی اور ناگن نے بیٹھ کر رات کاٹی۔ مونگا اندر نہیں آسکتی تھی۔ مگر اس کی آواز کو کون روک سکتا تھا۔ مونگا سے زیادہ ڈراونی اس کی آواز تھی۔

صبح کے وقت منشی جی باہر نکلے۔ اور مونگا سے بولے "یہاں کیوں پڑی ہے؟"

مونگا بولی۔ "تیرا خون پیوں گی"۔

ناگن نے بل کھا کر کہا۔ "تیرا منہ جھلس دوں گی"۔

مگر ناگن کے زہر نے مونگا پر کچھ اثر نہ کیا۔ اُس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ناگن کھسیانی سی ہو گئی۔ قہقہے کے مقابلے میں زبان بند ہو جاتی ہے۔

منشی جی پھر بولے "یہاں سے اُٹھ جا"۔

"نہ اُٹھوں گی"۔

"کب تک پڑی رہے گی؟"

"تیرا لہو پی کے جاؤں گی"۔

منشی جی کی پُر زور تحریر کا یہاں کچھ زور نہ چلا۔ اور ناگن کی آتشیں تقریر

یہاں بسر د ہو گئی۔ دونوں گھر میں جا کر مشورہ کرنے لگے۔ یہ بلا کیونکر ٹلے گی۔ اس آفت سے کیونکر نجات ہو گی۔

دیوی آتی ہیں، تو بکرے کا خون پی کر چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ ڈائن انسان کا خون پینے آئی ہے۔ وہ خون جس کے اگر قلم بنانے میں چند قطرے نکل پڑتے تھے۔ تو ہفتوں اور مہینوں سارے کنبے کو افسوس رہتا تھا۔ اور یہ واقعہ گاؤں میں مرکز گفتگو بن جاتا تھا۔ کیا یہ خون پی کر موٹگا کا سوکھا ہوا جسم ہرا ہو جائے گا؟

گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ موٹگا منشی کے دروازے پر دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔ منشی جی کی رسوائی میں گاؤں والوں کو خواہ مخواہ لطف آتا تھا۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ اس دروازے پر وقتاً فوقتاً میلے لگتے رہتے تھے۔ مگر وہ پُرشور اور پُرخروش میلے ہوتے تھے۔ آج کا مجمع خاموش اور متین تھا۔ یہ دکا دکا اور جلسں رام غلام کو مرغوب نہ تھا۔ موٹگا پر اُسے ایسا غصہ آ رہا تھا۔ کہ اس کا بس چلتا تو ضرور کنوئیں میں دھکیل دیتا۔ کہتا۔ "چل کنوئیں پر تجھے پانی پلا لاؤں۔" جب وہ کنوئیں پر پہنچتی تو پیچھے سے ایسا دھکا دیتا کہ وہ دھم سے کنوئیں میں جا گرتی۔ اور وہاں بیٹھے ہوئے کتے کی طرح چیخنے لگتی۔ دھماکے کی آواز آتی! اس خیال سے رام غلام کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اور وہ مشکل سے اپنی ہنسی کو روک سکا۔ کیسے مزے کی بات ہوتی۔ مگر یہ چڑیل یہاں سے اٹھتی ہی نہیں کیا کروں؟ منشی جی کے گھر میں استخوانی نسل کی ایک گائے تھی، کھلی۔ دانہ اور بھوسہ تو اسے بڑی کثرت سے کھلایا جاتا تھا۔ مگر وہ سب

اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جاتا تھا۔ اور اس کا ڈھانچہ روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ رام غلام نے ایک ہانڈی میں اس کا گوبر گھولا۔ اور وہ ساری غلاظت مونگا پر لاکر انڈیل دی۔ اور پھر اس کے چھینٹے تماشائیوں پر ڈال دیئے۔ غریب مونگا لت پت ہو گئی اور اٹھ کر رام غلام کی طرف دوڑی۔ صدہا تماشائیوں کے کپڑے خراب ہو گئے۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے یہ منشی رام سیوک کا دروازہ ہے۔ یہاں اسی طرح کی مدارات کی جاتی ہے۔ جلد بھاگ چلو۔ ورنہ اب کے کوئی اس سے اچھی خاطر کی جائیگی۔ ادھر مطلع صاف ہوا۔ ادھر رام غلام گھر میں جاکر خوب ہنسا اور خوب تالیاں بجائیں۔ منشی جی نے اس مجمع ناجائز کو ایسی آسانی اور خوبصورتی سے ہٹا دینے کی تدبیر پر اپنے سعادت مند لڑکے کی پیٹھ ٹھونکی۔ مگر سب بھاگ گئے! مونگا جوں کی توں بیٹھی رہی۔

دوپہر ہوئی۔ مونگا نے کھانا نہیں کھایا۔ شام ہوئی۔ ہزاروں اصرار کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گاؤں کے چودھری نے خوشامدیں کیں۔ حتیٰ کہ منشی جی نے ہاتھ تک جوڑے مگر دیوی راضی نہ ہوئی۔ آخر منشی جی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ ان کا قول تھا۔ روٹھنے والوں کو بھوک آپ منا لیا کرتی ہے۔ مونگا نے یہ رات بھی بے آب و دانہ کاٹی۔ اور لالہ صاحب اور ان کی زوجہ غمگسار نے آج پھر جاگ جاگ کر صبح کی۔ آج مونگا کے نعرے اور قہقہے بہت کم سنائی دیئے۔ گھر والوں نے سمجھا۔ بلا ٹل گئی۔ سویرا ہوتے ہی جو دروازے پر آکر دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی جان نکل چکی تھی۔ وہ اس دروازے پر جان ہی دینے آئی تھی۔ جس نے اس کی

جھٹالی تھی۔ اسی کو جان بھی سونپ دی۔ اپنی مٹی تک اس کی نذر کر دی۔

یہ ذکر کہ گاؤں میں کیسی ہل چل مچی، اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے فضول ہے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنی ہل چل مچ سکتی ہے۔ اس سے کچھ زیادہ ہی مچی۔ اور منشی جی کی جتنی ذلت ہونی چاہیئے تھی۔ اُس سے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے کا انہیں بھچّہ نے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر میں کوئی گائے بندھی بندھی مر جاتی ہے۔ تو وہ شخص مہینوں در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے۔ نہ کہار اس کا پانی بھرے۔ نہ کوئی اسے چھوئے۔ یہ گؤ ہتیا کا پرائشچت ہے۔ برہم ہتیا کی سزائیں اس سے بدرجہا سخت اور ذلتیں بدرجہا زیادہ ہیں۔ مونگا یہ جانتی تھی اور اسی لیئے اس دروازے پر آ کر مری تھی۔ کہ میں جو زندہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ مر کر بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ گوبر کا اُپلا جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ تو سادھو سنت لوگ اُسے ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔ پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کر آگ سے بھی زیادہ خطرناک اور قاتل ہو جاتا ہے۔

(۵)

منشی رام سیوک قانون دان آدمی تھے۔ قانون نے اُن پر کوئی جرم نہیں لگایا تھا۔ مونگا کسی قانونی دفعہ کے منشا کے مطابق نہیں مری تھی۔ تعزیرات ہند میں اس کی کوئی نظیر نہ ملتی تھی۔ اس لیئے جو لوگ ان سے پرائشچت کرانا چاہتے تھے۔ اُن کی سخت غلطی تھی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کہار پانی نہ بھرے گا۔ وہ خود اپنا پانی آپ بھر سکتے تھے۔ اپنا کام کرتے میں کوئی شرم نہیں۔ بلا

سے حجام بال نہ بنائے گا۔ حجامت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ڈاڑھی بہت
خوبصورت چیز ہے۔ ڈاڑھی مرد کا زیور اور سنگار ہے۔ اور پھر جو بالوں سے
ایسی ہی نفرت ہو گی تو ایک ایک آنے میں تو اُسترے آتے ہیں۔ دھوبی کپڑے
نہ دھونے لگا۔ اس کی بھی کچھ پروا نہیں۔ صابون کوڑیوں کے مول آتا ہے۔ ایک
بٹی میں درجنوں کپڑے ایسے صاف ہو جائیں۔ جیسے بگلے کا پر۔ دھوبی کیا
کھا کے ایسے صاف کپڑے دھوئے گا۔ کمبخت پتھر پر ٹپک ٹپک کر کپڑوں کا
لتّہ نکال لیتا ہے۔ خود پہنے۔ دوسروں کو پہنائے۔ بھٹی میں چڑھائے ڈیہہ
میں بھگوئے۔ کپڑوں کی دُرگت کر ڈالتا ہے۔ جبھی تو کُرتے دو۔ تین سال سے زیادہ
نہیں چلتے ورنہ دادا اہر پانچویں سال دو اچکن اور دو کُرتے بنوایا کرتے تھے۔
منشی رام سیوک اور اُن کی زوجہ غمگسار نے دن بھر یوں ہی اپنے دِلوں
کو سمجھا کر ٹالا۔

مگر شام ہوتے ہی اُن کی قوتِ استدلال نے جواب دے دیا۔ ان کے دلوں
پر ایک بے معنی، بے بنیاد، مہمل خوف کا غلبہ ہوا۔ اور رات کے ساتھ ساتھ
خوف کا بھی حساب مشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ناگن کھانا پکانے کیلئے رسوئی
کے کمرے میں تنہا نہ جاسکی۔ باہر کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ مگر
کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ جاکر دروازہ بند کر آئے۔ آخر ناگن نے ہاتھ
میں چراغ لیا۔ منشی جی نے کلہاڑا اور رام غلام نے گنڈاسہ۔ اس قطع سے
تینوں آدمی چونکتے، ہچکچاتے، دروازے تک آئے۔ یہاں منشی جی نے
بڑی جرأت سے کام لیا۔ انہوں نے بے دھڑک دروازے سے باہر

نکلنے کی کوشش کی۔ اور کانپتی ہوئی مگر بلند آواز میں ناگن سے بولے "تم ناحق ڈرتی ہو۔ کیا یہاں وہ بیٹھی ہے۔"

مگر وفادار ناگن نے انہیں اندر کھینچ لیا۔ اور خفا ہو کر بولیں "تمہارا یہی لڑکپن تو اچھا نہیں۔" یہ مہم فتح کر کے تینوں آدمی رسوئی کے کمرے میں آئے۔ اور کھانا پکنا شروع ہوا۔

مگر مونگا ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر مونگا کا گمان ہوتا ہوتا تھا۔ اندھیرے کونوں میں مونگا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ، وہی جھنڈولے بال، وہی وحشت، وہی ڈراونی آنکھیں مونگا کا نکھ سکھ دکھائی دیتا تھا۔ اسی کمرے میں آٹا، دال کے کئی مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ وہیں کچھ پرانے چیتھڑے بھی پڑے تھے۔ ایک چوہے کو بھوک نے بے چین کیا۔ مٹکوں نے کبھی اناج کی صورت نہیں دیکھی۔ مگر سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ اس گھر کے چوہے غضب کے ڈاکو ہیں۔ وہ ان دانوں کی تلاش میں جو مٹکوں سے کبھی نہیں گرے تھے۔ رینگتا اس چیتھڑے کے نیچے آنکلا۔ کپڑے میں حرکت ہوئی۔ پھیلے ہوئے چیتھڑے مونگا کی نیلی ٹانگیں بن گئے۔ ناگن دیکھتے ہی جھجکی اور چیخ اٹھی۔ منشی جی بدحواس ہو کر دروازے کی طرف لپکے رام غلام دوڑ کر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بارے چوہا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر ان لوگوں کے ہوش بجا ہوئے۔ اب منشی جی مردانہ وار قدم اٹھاتے مٹکے کی طرف چلے۔ ناگن نے طنز سے کہا "رہنے بھی دو۔ دیکھ لی تمہاری مردمی"۔

منشی جی وفادار ناگن کی اس ناقدری پر بہت بگڑے "کیا تم سمجھتی ہو۔

میں ڈر گیا۔ بھلا ڈر کی کیا بات تھی۔ مونگا مر گئی۔ اب کیا وہ بیٹھی ہے۔ کل میں دروازے کے باہر نکل گیا تھا، تم روکتی ہی رہیں اور میں نہ مانا۔"

منشی جی کی اس زبردست دلیل نے ناگن کو لاجواب کر دیا۔ کل دروازے کے باہر نکل جانا یا نکلنے کی کوشش کرنا معمولی کام نہ تھا۔ جس کی جرأت کا ایسا ثبوت مل چکا ہو اُسے بزدل کون کہہ سکتا ہے۔ یہ ناگن کی ہٹ دھرمی تھی۔

کھانا کھا کر تینوں آدمی سونے کے مکان میں آئے لیکن مونگا نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ باتیں کرتے تھے۔ دل کو بہلاتے تھے۔ ناگن نے راجہ ہردول اور رانی سارندھا کی کہانیاں کہیں۔ منشی جی نے چند مقامات کی تفصیل بیان کی۔ مگر تدبیروں کے باوجود مونگا کی تصویر آنکھوں کے سامنے سے دور نہ ہوتی تھی۔ ذرا کواڑ کھٹکا اور دونوں چونک پڑے۔ پتوں میں سنسناہٹ ہوئی اور دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور رہ رہ کر ایک مدھم آواز نہ جانے کہاں سے، شاید آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے سے ان کے کانوں میں آتی تھی۔ "میں تیرا خون پیوں گی۔"

(۲)

آدھی رات کو ناگن عالمِ غنودگی سے چونکی۔ وہ غریب ان دنوں حاملہ تھی۔ سرخ آتشیں آنکھوں والی، تیز نکیلے دانتوں والی مونگا اس کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناگن چیخ مار کر اٹھی۔ ایک عالمِ وحشت میں بھاگ کر آنگن میں آئی۔ اور فرش پر اس سے زمین پر گر پڑی۔ سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ منشی جی نے بھی اس کی چیخ سنی۔ مگر خوف کے مارے آنکھیں نہ

کھولیں۔ اندھوں کی طرح دروازہ ٹٹولتے رہے۔ بہت دیر کے بعد انہیں دروازہ ملا، آنگن میں آئے۔ ناگن زمین پر پڑی ہاتھ پاؤں ٹپک رہی تھی۔ اُسے اٹھا کر اندر لائے مگر رات بھر اُس نے آنکھیں نہ کھولیں، صبح کو ہڈیاں بجنے لگیں، تھوڑی دیر میں بخار ہو آیا، جسم سُرخ توا ہو گیا۔ شام ہوتے ہوتے سرسام ہوا، اور آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ناگن اس دُنیا سے چل بسی۔ مونگا کے خوف نے اس کی جان لی۔ جب تک مونگا زندہ رہی وہ ناگن کی پھنکار سے ہمیشہ ڈرتی رہی، عالم جنوں میں بھی اُس نے ناگن کا سامنا کبھی نہیں کیا۔ مگر اپنی جان دے کر آج اس نے ناگن کی جان لی، خوف میں بڑی طاقت ہے۔ انسان ہوا میں ایک گرہ نہیں لگا سکتا، خوف نے ہوا میں ایک دُنیا بنا ڈالی ہے۔

رات گزر گئی۔ دن چڑھتا آتا تھا، مگر گاؤں کا کوئی آدمی لاش اٹھانے کیلئے دروازے پر نہ آتا تھا، منشی جی گھر گھر گھومے مگر کوئی نہ نکلا، ہتیارے کے دروازے پر کون جائے۔ ہتیارے کی لاش کون اُٹھائے، منشی جی کی رعب ان کے خونخوار قلم کا خوف اور قانونی مصلحت آمیزیاں، کچھ بھی کارگر نہ ہوا چاروں طرف سے ہار کر منشی جی پھر اپنے خانۂ تاریک میں آئے۔ مگر اندر قدم نہیں رکھا جاتا تھا، نہ باہر کھڑے رہ سکتے تھے۔ باہر مونگا اندر ناگن۔ دل پر بہت جبر کر کے ہنومان چالیسا کا ورد کرتے ہوئے وہ مکان میں گئے۔ اس وقت ان کے دل پر جو گزر رہی تھی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ دوسری شادی تو ہو سکتی تھی۔ ابھی اسی پھاگن

میں تو پچاسواں سال تھا، مگر ایسی زبان دراز، خوش بیان عورت کہاں ملے گی۔ افسوس کہ اب تقاضا کرنے والوں سے بحث کون کرے گا، کون انہیں لاجواب کرے گا، لین دین کا حساب کون اتنی خوبی سے کریگا، کس کی آواز بلند تیر کی طرح اہلِ تقاضا کے سینوں میں چبھے گی۔ اس نقصان کی تلافی اب ممکن نہیں!

دوسرے دن منشی جی لاش کو ایک ٹھیلے پر لاد کر گنگا جی کی طرف چلے۔ عزاداروں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ ایک منشی جی، دوسرا رام غلام۔ اس ہیئت کذائی سے مونگا کی لاش بھی نہیں اٹھی تھی۔

مگر مونگا نے ناگن کی جان لیکر بھی منشی جی کا پنڈ نہ چھوڑا، لیلیٰ کی تصویر مجنوں کے پردۂ دماغ پر ایسے شوخ رنگوں سے شاید ہی کھنچی ہو۔ آٹھوں پہر اُن کا خیال اُسی طرف لگا رہتا ہے۔ اگر دل بہلاؤ کا کوئی ذریعہ ہوتا تو شاید انہیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر گاؤں کا کوئی ذی روح ان کے دروازے کی طرف جھانکتا بھی نہ تھا۔ غریب اپنے ہاتھوں پانی بھرتے، خود برتن دھوتے۔ غم اور غصہ، فکر اور خوف اتنے دشمنوں کے مقابلے میں ایک دماغ کب تک ٹھہر سکتا تھا خصوصاً وہ دماغ جو روزانہ قانونی مباحثوں میں صرف تسخیر ہو جاتا ہو۔

کنجِ تنہائی کے دس بارہ دن جوں توں کر کے کٹے۔ چودھویں دن منشی جی نے کپڑے بدلے اور بستہ لئے ہوئے کچہری چلے۔ آج ان کا چہرہ کچھ روشن تھا۔ جاتے ہی میرے مؤکل دوڑ کر مجھے گھیر لیں گے۔ ماتم پرسی کریں گے، میں آنسوؤں کے دو چار قطرے گرا دوں گا، پھر بیعنامہ، رہن نامہ، صلح نامہ وغیرہ کا ایک طوفان بلکہ سیلاب سامنے آ جائے گا۔ یہ خیال انہیں خوش کیے ہوئے

تھا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ روپے کی صورت نظر آئے گی۔ شام کو ذرا شغل ہو جائے گا۔ اس کے چھوٹنے سے توجی اور اُچاٹ تھا۔ انہیں خیالوں میں سرخوش منشی جی کچہری پہنچے۔

مگر وہاں رحمٰن ناموں کے طوفان۔ بیع ناموں کے سیلاب اور مؤکلوں کی چہل پہل کے بدلے مایوسی کا ایک کف دست۔ حوصلہ شکن ریگستان نظر آیا۔ بستہ کھولے گھنٹوں بیٹھے رہے۔ مگر کوئی مخاطب نہ ہوا۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا۔ کہ مزاج کیسا ہے؟ نئے مؤکل تو خیر۔ بڑے بڑے پرانے مؤکل جن کا منشی کے ساتھ پشتوں سے تعلق چلا آتا تھا۔ آج ان سے گریز کرنے لگے۔ وہ نالائق اور بدتمیز رمضان خان جیسے بے شعور آدمی تھا۔ املا تک غلط لکھتا۔ منشی جی اس کا خوب مضحکہ اُڑاتے تھے۔ مگر آج سینکڑوں آدمی اسے گھیرے ہوئے تھے۔ بے تمیز گویوں میں گھنیا نا ہوا تھا۔ واہ ری قسمت! مؤکل کمبخت یوں منہ پھیرے چلے جاتے تھے۔ گو یا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ دن بھر مؤکلوں کا انتظار کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر کی طرف چلے۔ پژمردہ۔ مایوس۔ متفکر۔ اور جوں جوں گھر نزدیک آتا تھا۔ مونگا کی تصویر سامنے آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب شام کو گھر پہنچ کر دروازہ کھولا۔ اور دو کتے جنہیں رام غلام نے شرارتاً بند کر رکھا تھا۔ جھپٹ کر باہر نکلے تو منشی جی کے اوسان ختم ہو گئے۔ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے ؛

انسان کا دل اور دماغ خوف سے جس قدر متاثر ہوتا ہے۔ اتنا کسی اور طاقت سے نہیں۔ محبت۔ افسوس۔ مایوسی، جُدائی۔ نقصان یہ سب دل پر

کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں۔ مگر یہ اثرات ہلکے ہلکے جھونکے ہیں۔ اور خوف کا اثر طوفان ہے۔ منشی رام سیوک پر بعد کو کیا گزری۔ یہ معلوم نہیں۔ کئی دن تک لوگوں نے انہیں روزانہ کچہری جاتے دیکھا۔ اور وہاں سے افسردہ اور پژمردہ لوٹتے دیکھا۔ کچہری جانا ان کا فرض تھا۔ اور گو وہاں مؤکلوں کا قحط تھا۔ مگر تقاضے والوں سے گلا چھڑانے اور انہیں اطمینان دلانے کیلئے اب یہی ایک لٹکا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی ماہ تک نظر نہ آئے۔ بدری ناتھ چلے گئے۔

ایک دن گاؤں میں ایک سادھو آیا۔ بھبوت رمائے۔ لمبی لمبی جٹائیں۔ ہاتھ میں کمنڈل۔ اس کی صورت منشی رام سیوک سے بہت ملتی تھی۔ آواز اور رفتار میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا رہا۔ اسی رات کو منشی رام سیوک کے گھر سے دھواں اٹھا۔ پھر شعلے نظر آئے۔ اور آگ بھڑک اٹھی۔ ناگن کی آتش تقریر بھی کبھی اس قدر نہ بھڑکی تھی۔ گاؤں کے سینکڑوں آدمی دوڑے مگر آگ بجھانے کیلئے نہیں۔ تماشا دیکھنے کیلئے۔ ایک بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہے!

صاحبزادہ رام غلام منشی جی کے غائب ہو جانے پر اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے۔ اور وہاں کچھ دنوں رہے۔ مگر وہاں ان کی خوش فعلیاں نہ پسند کی گئیں۔ ایک روز آپ نے کسی کے کھیت میں ہولے نوچے اس نے دو چار دھول لگا دیے۔ اس پر آپ اس قدر برہم ہوئے۔ کہ جب اس کے چنے کھلیان میں آئے۔ تو جا کر آگ لگا دی۔ ایک کے پیچھے سارا کھلیان جل کر راکھ ہو گیا۔ ہزاروں روپے کا نقصان ہوا۔ پولیس نے تحقیقات کی۔ حضرت گرفتار ہوئے۔ اپنے قصور کا اقبال کیا۔ اور اب چنار کے ریفارمیٹری اسکول میں موجود ہیں۔

قربانی

(۱)

انسان کی حیثیت کا سب سے زیادہ اثر غالباً اس کے نام پر پڑتا ہے۔ منگرو ٹھاکر جب سے کانسٹیبل ہو گئے ہیں، ان کا نام منگل سنگھ ہو گیا ہے۔ اب انہیں کوئی منگرو کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کلو اہیر نے جب سے تھانہ دار صاحب سے دوستی کی ہے اور گاؤں کا مکھیا ہو گیا ہے۔ اس کا نام کالکا دین ہو گیا ہے۔ اب کوئی کلو کہے تو وہ آنکھیں لال پیلی کرتا ہے۔ اسی طرح ہرکھ چند کرمی اب ہرکھو ہو گیا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اس کے یہاں شکر بنتی تھی۔ کئی ہل کی کھیتی ہوتی تھی، کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا۔ لیکن بدیشی شکر کی آمد نے اسے اتنا نقصان پہنچایا کہ رفتہ رفتہ کارخانہ ٹوٹ گیا، ہل ٹوٹ گئے۔ کاروبار ٹوٹ گیا، زمین ٹوٹ گئی اور وہ خود ٹوٹ گیا۔ ستر برس کا بوڑھا ایک تکیہ دار ماچے پر بیٹھا ہوا ناریل پیا کرتا تھا۔ اب سر پر ٹوکرا لے کے کھاد پھینکنے جاتا ہے۔

لیکن اس کے انداز میں اب بھی ایک خودداری ہے، چہرہ پر اب بھی متانت، گفتگو میں اب بھی ایک شان ہے جس پر گردش ایام کا اثر نہیں پڑا۔ رسی جل گئی۔ پر بل نہیں ٹوٹا۔ ایام نیک انسان کے اطوار پر ہمیشہ کیلئے اپنی مہر چھوڑ جاتے ہیں، ہرکھو کے قبضہ میں اب صرف ۵ بیگھہ زمین ہے۔ صرف دو بیل ہیں، ایک ہل کی کھیتی ہوتی ہے۔ لیکن پنچایتوں میں باہمی نزاع کے فیصلوں میں اس کی رائیں اب بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، وہ جو بات کہتا ہے۔ بے لاگ کہتا ہے۔ اس گاؤں کے نوبڑھے اس کے مقابلہ میں زبان نہیں کھولتے۔

ہرکھو نے اپنی زندگی میں کبھی دوا نہیں کھائی۔ وہ بیمار ضرور پڑتا تھا، کنوار کے مہینہ میں جب میریا بخار کا دورہ ہوتا۔ تو سب سے پہلے اس کا اثر ہرکھو پر ہوتا، لیکن ہفتہ عشرہ میں وہ بلا دوا کھائے ہی چنگا ہو جاتا تھا، اب کے بھی وہ حسب معمول بیمار پڑا اور دوا نہ کھائی۔ لیکن بخار اب کے موت کا پروانہ لیکر چلا تھا، ہفتہ گزرا، دو ہفتے گزر گئے، مہینہ گزر گیا۔ اور ہرکھو چارپائی سے نہ اٹھا، اب اسے دوا کی ضرورت معلوم ہوا۔ اس کا لڑکا گردھاری کبھی نیم کی سینکیں پلاتا، کبھی گرچ کا عرق، کبھی گت بورنا کی جڑ۔ لیکن اس کو کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا، ایک دن منگل سنگھ کانسٹیبل ہرکھو کے پاس بیمار پرسی کیلئے گئے۔ غریب ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھا رام نام جپ رہا تھا، منگل سنگھ نے کہا "بابا کوئی دوا کھائے بغیر بیماری نہ جائے گی کونین کیوں نہیں کھاتے؟" ہرکھو نے متوکلانہ انداز سے کہا "تو لیتے آنا"

دوسرے دن کالکا دین نے جا کر کہا "بابا دو چار دن کوئی دوا کھا لو۔ اب تمہارے بدن میں وہ بوتا تھوڑے ہی ہے کہ بنا دوا دارو کے اچھے ہو جاؤ؟"

اُن سے بھی ہرکھو نے سائلانہ انداز سے کہا "تو لیتے آنا"
لیکن یہ رسمی عیادتیں تھیں۔ ہمدردی سے خالی۔ نہ منگل سنگھ نے خبر لی۔ نہ کالکادین نے نہ کسی دوسرے نے۔ ہرکھو اپنے برآمدے میں کھاٹ پر پڑا معلوم نہیں کس خیال میں غرق رہتا۔ منگل سنگھ کبھی نظر آجاتے تو کہتا "بھیا۔ وہ دوا نہیں لائے؟"
منگل سنگھ کترا کر نکل جاتے۔ کالکادین دکھائی دیتے تو اُن سے بھی یہی سوال کرتا۔ لیکن وہ بھی نظر بچا جاتے۔ یا تو اُسے یہ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ کہ دوا دارو بغیر پیسوں کے نہیں آتی۔ یا وہ پیسے کو جان سے بھی سوا عزیز سمجھتا تھا۔ یا اس کا یہ فلسفہ دوا دارو میں مانع تھا۔ کہ جب بھوگ پورا ہو جائیگا۔ تو بیماری خود بخود چلی جائے گی۔ اس نے کبھی قیمت کا ذکر نہیں کیا۔ اور دوا نہ آئی اور اس کی حالت ردّی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ پانچ مہینے تک دکھ جھیلنے کے بعد وہ عین ہولی کے دن اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ گردھاری نے لاش بڑی دھوم دھام سے نکالی کریا کرم بڑے حوصلہ سے کیا۔ کئی گاؤں کے برہمنوں کو بھوج دیا۔ سارے گاؤں نے ماتم منایا۔ ہولی نہ منائی گئی۔ نہ عبیر اور گلال اڑے۔ نہ دف کی صدا بلند ہوئی نہ بھنگ کے پرنالے چلے۔ کچھ لوگ دل میں بڈھے کو کوستے ضرور تھے۔ کہ اسے آج ہی مرنا تھا۔ وہ ایک دن بعد مرتا۔ لیکن اتنا بے غیرت کوئی نہ تھا۔ کہ غم میں جشن کرتا۔ وہ شہر نہیں تھا۔ جہاں کوئی کسی کا شریک نہیں ہوتا۔ جہاں ہمسایہ کے نالہ و زاری کی صدا ہمارے کانوں تک نہیں پہنچتی۔

(۲)

ہرکھو کے کھیت گاؤں والوں کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ پانچوں بیگھہ

زمین، کنوئیں قریب، زرخیز، کھاد پانس سے لدی ہوئی، مینڈھ باندھے درست تھی۔ اس میں تین تین فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ ہرکھو کے مرنے سے ان پر چاروں طرف سے یورش ہونے لگی۔ گردھاری کریاکرم میں مصروف تھا۔ اور گاؤں کے متمول کاشتکار لالہ اونکار ناتھ کو چین نہ لینے دیتے تھے۔ نذرانہ کی بڑی بڑی رقمیں پیش کی جاتی تھیں۔ کوئی سال بھر کا لگان پیشگی ادا کرنے کو تیار تھا۔ کوئی نذرانہ کی دوگنی رقم کی دستاویز لکھنے کو آمادہ۔ لیکن اونکار ناتھ اُن سبھوں کو لطائف الحلیل سے ٹالتے رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ گردھاری کے باپ نے ان کھیتوں کو بیس سال تک جوتا ہے۔ اور ان پر گردھاری کا حق سب سے زیادہ ہے۔ وہ اگر دوسروں سے کم نذرانہ بھی دے، تو یہ زمین اسی کے پاس رہنی چاہئیے۔ چنانچہ جب گردھاری کریاکرم سے فرصت پا چکا۔ اور چیت کا مہینہ ختم ہونے آیا۔ تو اونکار ناتھ نے گردھاری لال کو بلوایا۔ اور اُس سے پوچھا۔ "کھیتوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

گردھاری نے رو کر کہا۔ "حضور انہیں کھیتوں ہی کا تو آسرا ہے۔ جوتوں گا نہ تو کیا کروں گا؟"

اونکار ناتھ:۔ نہیں تو میں تم سے کھیت نکالنے کو تھوڑے ہی کہتا ہوں۔ ہرکھو نے بیس سال تک انہیں جوتا اور کبھی ایک پیسہ باقی نہیں رکھا۔ تم ان کے لڑکے ہو۔ اور تمہارا اس زمین پر حق ہے۔ لیکن تم دیکھتے ہو۔ اب زمین کا دام کتنا بڑھ گیا ہے۔ تم آٹھ روپیہ بیگھہ پر جوتتے تھے۔ مجھے دس روپیہ بیگھہ مل رہے ہیں۔ اور نذرانہ کے سو روپیہ الگ ہیں۔ تمہارے ساتھ رعائت کرکے لگان وہی رکھتا ہوں۔ لیکن نذرانہ کے روپیے تمہیں دینے پڑیں گے۔"

گردھاری :- سرکار میرے گھر میں تو اس وقت روٹیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں ہے، اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں گا؟ جو کچھ جمع جتھا تھی، وہ دادا کے کریا کرم میں خرچ ہو گئی۔ اناج کھلیان ہی میں ہے۔ لیکن دادا کے بیمار ہو جانے سے اب کی ربیع بھی اچھی نہیں ہوئی۔ میں روپیہ کہاں سے لاؤں گا؟"

انکار ناتھ :- "ہاں زیر بار تو تم ہو رہے ہو۔ تم نے کریا کرم خوب دل کھول کر کیا۔ لیکن یہ تو دیکھو میں اتنا نقصان کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ دس روپیہ سال کی رعایت کر رہا ہوں، یہ کیا کم ہے؟"

گردھاری :- "نہیں سرکار آپ ہماری پرورش کرتے ہیں۔ تم نے سدا سے ہمارے اوپر دیا کی ہے۔ لیکن اتنا نجرانہ میرے لئے نہ ہو گا۔ میں آپکا گریب اسامی ہوں۔ دیس میں رہوں گا، تو جنم بھر آپکی گلامی کرتا رہوں گا۔ بیل بدھیا بیچ کر پچاس روپیہ حاجر کر دوں گا۔ اس سے بیشی کی میری ہمت نہیں پڑتی۔ آپ کو نارائن نے بہت کچھ دیا ہے۔ اتنی پرورش اور کیجیے۔"

انکار ناتھ کو گردھاری کا یہ انکار ناگوار گزرا۔ وہ اپنی دانست میں اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رعایت کر چکے تھے۔ کوئی دوسرا زمیندار اتنی رعایت بھی نہ کرتا۔ بولے "تم سمجھتے ہو گے۔ کہ یہ روپیہ لیکر ہم اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں، اور خوب چین کی بنسی بجاتے ہیں۔ لیکن ہمارے اوپر جو کچھ گزرتی ہے۔ وہ ہمیں جانتے ہیں۔ کہیں چندہ، کہیں نذرانہ کہیں انعام۔ کہیں اکرام۔ ان کے مارے ہمارا کچومر نکلا جاتا ہے۔ پھر ڈالیاں علیحدہ دینا پڑتی ہیں۔ جسے ڈالی نہ دو، وہی منہ پھیلاتا ہے۔ ہفتوں اسی فکر میں پریشان رہتا ہوں۔ صبح سے شام تک ننگوں

کا چکر لگاؤ۔ خانساماؤں اور اردلیوں کی خوشامد کرو۔ جن چیزوں کیلئے لڑکے ترس کر رہ جاتے ہیں۔ وہ منگا منگا کے ڈالیوں میں لگاتا ہوں۔ اگر نہ کروں تو مشکل ہو جائے۔ کبھی قانون گو آ گئے۔ کبھی تحصیلدار آ گئے۔ کبھی ڈپٹی صاحب کا لشکر آ گیا۔ ان سب کی مہمانی نہ کروں تو نکو بنوں۔ سال میں ہزار بارہ سو روپے انہیں باتوں میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کہاں سے آئے! اس پر اپنے گھر کا خرچ بس یہی جی چاہتا ہے کہ گھر چھوڑ کے نکل جاؤں۔ ہم زمین کیا ہے۔ جی کا جنجال ہے۔ ساری زندگی عملوں کی خوشامد اور خاطرداری میں کٹی جاتی ہے۔ یہ نہ ہوتی، تو کہیں چلا جاتا، چار پیسے کماتا اور بے فکری کی نیند سوتا۔

"ہم زمینداروں کو غریبوں کا گلا دبانے کے لئے ایشور نے اتنا پیادہ بنایا ہے۔ یہی اُن کا کام ہے۔ ادھر گلا دبا کے لینا اُدھر رو رو کے دینا۔ لیکن تم لوگ یہی سمجھتے ہو کہ سب ہمارے ہی گھر میں آتا ہے۔ تمہارے ساتھ اتنی رعائیت کر رہا ہوں۔ لیکن تم اتنے پر بھی خوش نہیں ہوتے تو بھئی تمہیں اختیار ہے۔"

نذرانہ میں ایک پیسہ بھی رعائیت نہ ہو گی۔ چیت ختم ہو رہا ہے۔ اگر ایک ہفتہ کے اندر روپیہ داخل کر دو گے۔ تو کھیت جوتنے پاؤ گے۔ نہیں تو میں کوئی دوسرا بندوبست کر دوں گا۔"

(۳)

گردھاری اداس اور مایوس گھر آیا۔ سو روپیہ کا انتظام اس کے قابو سے باہر تھا۔ سوچنے لگا۔ کہ اگر دونوں بیل بیچ دوں تو کھیت ہی لیکر کیا کروں گا گھر

نہ بچوں تو یہاں لینے والا ہی کون ہے؟ اور پھر باپ دادوں کا نام جاتا ہے۔ چار پانچ پیڑ ہیں، لیکن انہیں بیچ کر یہاں بچیں۔ تیس روپے ملیں گے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ قرض مانگوں تو دیتا ہی کون ہے۔ ابھی برہم بھوج کے آٹے، گھی کے پچاس روپیہ بنئے کے آتے ہیں۔ وہ اب ایک پیسہ بھی ادھار نہ دے گا۔ اس کے پاس گہنے بھی تو نہیں ہیں۔ نہیں تو وہی بیچ کر روپیہ لاتا۔ لے دے کے ایک ہنسلی بنوائی تھی۔ وہ بھی بنئے کے گھر پڑی ہوئی ہے۔ سال بھر بیت گیا، چھڑانے کی نوبت نہ آئی۔ گردھاری اور اس کی بیوی سبھاگی۔ دونوں ہی اسی فکر میں رات دن غلطاں و پیچاں رہتے تھے۔ لیکن کوئی نئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

گردھاری کو کھانا پینا اچھا نہ لگتا۔ راتوں کو نیند نہ آتی۔ ہر دم دل پر ایک بوجھ سا رکھا رہتا۔ کھیتوں کے نکلنے کا خیال آتے ہی اس کے جگر میں ایک آگ سی لگ جاتی تھی۔ ہائے وہ زمین جسے ہم نے بیس برس جوتا۔ جسے کھاد سے پاٹا۔ جس میں میڑین رکھیں۔ جس کی مینڈیں بنائیں۔ اُن کا مزہ اب دوسرا اٹھائے گا۔

کھیت اس کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ اس کی ایک ایک انگل زمین اس کے خونِ جگر سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ان کے نام اُس کی زبان پر اس طرح آتے تھے۔ جیسے اپنے تینوں بچوں کے۔ کوئی چوبیسو تھا، کوئی بائسو تھا۔ کوئی نالے پر والا، کوئی تلیا والا۔ ان ناموں کے آتے ہی کھیتوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ ان ناموں کا اس طرح ذکر کرتا تھا۔ گویا وہ ذی روح ہیں۔ گویا وہ جاندار ہیں

ہیں۔ اس کی ہستی کے سارے منصوبے، سارے ہوائی قلعے، ساری من کی مٹھائیاں، ساری آرزوئیں، سارے حوصلے انہیں کھیتوں سے وابستہ تھے۔ ان کھیتوں کے بغیر وہ اپنی زندگی کا خیال ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔ وہ گھر سے ایک حسرتناک وحشت کے عالم میں نکل جاتا اور گھنٹوں کھیتوں کی مینڈ پر بیٹھا ہوا رویا کرتا۔ گویا ان سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو رہا ہے۔

اس طرح ایک پورا ہفتہ گزر گیا۔ اور گردھاری روپیہ کا کوئی بندوبست نہ کر سکا۔

آٹھویں دن اسے معلوم ہوا کہ کالکا دین نے انہیں سو روپیہ نذرانے کر دس روپیہ بیگھہ پر لے لیا ہے۔

گردھاری نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ ایک لمحہ کے بعد وہ اپنے دادا کا نام لے کر زار زار رونے لگا۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔

اس دن گھر میں چولہا نہیں جلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ہر کھو آج مرا ہے۔ اس کی موت کا صدمہ آج ہو رہا تھا۔

(۴)

لیکن سبھاگی یوں تقدیر پر شاکر ہونے والی عورت نہ تھی۔ وہ خانہ جنگیوں میں اکثر زبان کے تیر و تفنگ سے غالب آجایا کرتی تھی۔ ان اسلحہ کی تاثیر کی وہ قائل تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر ایک میدان میں وہ یکساں کاٹ کرتے ہیں۔ اسمیں وہ متانت نہیں تھی۔ جو خطرہ کو اپنی قوت سے باہر دیکھ کر توکل کی پناہ لیتی ہے۔

وہ غصّہ میں بھری ہوئی کالکادین کے گھر گئی۔ اور اُس کی بیوی کو خوب صلواتیں سُنائیں۔ "کل کا بانی آج کا سیٹھ۔ کھیت جوتنے چلے ہیں۔ دیکھوں گی کون میرے کھیت میں ہل لے جاتا ہے۔ اپنا اور اس کا لہو ایک کر دوں۔ روپیہ کا گھمنڈ ہوا ہے۔ تو بیں یہ گھمنڈ توڑ دوں گی۔"

پڑوسیوں نے اس کی حمائت کی۔ "سچ تو ہے۔ آپس میں چڑھا اتری نہیں چاہیئے۔ نارائین نے دھن دیا ہے۔ تو کیا غریبوں کو کچلتے پھریں گے۔" سبھاگی نے سمجھا۔ میں نے میدان مار لیا۔ لیکن وہی ہوا جو پانی میں تلاطم پیدا کرتی ہے۔ درختوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالتی ہے۔ ننھی ننھی جھاڑیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سبھاگی تو پڑوسیوں کے گھر میں بیٹھی ہوئی اپنے دکھڑے روتی اور کالکادین کی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کر لڑتی۔ اور گردھاری اپنے دروازے پر اُداس بیٹھا ہوا سوچتا۔ کہ اب میرا کیا حال ہوگا؟ اب یہ زندگی کیسے پار لگے گی۔ یہ لڑکے کس دروازے پر جائیں گے۔ مزدوری کے خیال ہی سے اس کے دل میں ایک درد اُٹھنے لگتا تھا۔ مدتوں آزادانہ باعزت زندگی بسر کرنے کے بعد مزدوری اس کی نگاہ میں موت سے بدتر تھی۔ وہ اب تک گرہست تھا۔ گاؤں میں اس کا شمار بھلے آدمیوں میں ہوتا تھا۔ اُسے گاؤں کے معاملات میں بولنے کا حق حاصل تھا۔ اس کے گھر میں دولت نہ ہو۔ لیکن وقار تھا۔ نائی۔ بڑھئی اور کمہار اور پروہت۔ اور چوکیدار سب کے سب اس کے نمک خوار تھے۔ اب یہ عزت کہاں؟ اب کون اس کی بات پوچھے گا۔ کون اس کے دروازے پر آئے گا۔ اب اسے کسی کے برابر بیٹھنے کا۔ کسی کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں۔

ہے۔ اب اسے پیٹ کیلئے دوسروں کی غلامی کرنے والا مزدور بننا پڑے گا۔
اب پہر رات رہے کون بیلوں کو ناندیں لگائے گا۔ کون ان کے لئے چھانٹا
کتائے گا؟ وہ دن اب کہاں، جب گیت گا گا کر ہل جوتتا تھا، چوٹی سے
پسینہ ایڑی تک آتا تھا، لیکن ذرا بھی تھکن نہ معلوم ہوتی تھی۔ اپنے لہلہاتے
ہوئے کھیتوں کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ کھلیان میں اناج کے انبار سامنے
دیکھتے ہوئے وہ سنسار کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اب کھلیان سے اناج کے
ٹوکرے بھر بھر کر کون لائے گا۔ اب کہاں نے کہاں، بکھار کہاں۔ اب یہ دروازہ
سُونا ہو جائے گا۔ یہاں گرد اڑے گی اور کتے لوٹیں گے دروازہ پر بیلوں کی
پیاری پیاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی۔ ان کو آرزو مند آنکھیں
کہاں دیکھنے کو ملیں گی۔ دروازے کی سوبھا نہ رہے گی۔"

اس حسرتناک خیال کے آتے ہی گردھاری کی آنکھوں سے آنسو بہنے
لگتے تھے۔ اس نے دوسروں کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ بس حسرت اور ملال
میں محو بیٹھا رہتا۔ گاؤں کے دو چار آدمی کار کا دین سے حسد رکھتے تھے۔
اس کے ساتھ ہمدردی کرتے آتے۔ پر وہ ان سے بھی کھل کر نہ بولتا۔ اُسے
ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا میں سب کی نگاہوں سے گر گیا ہوں۔ اگر کوئی اسے
سمجھاتا کہ تم نے کریا کرم میں ناحق اتنے روپے اڑا دیئے۔ تو اسے بہت ناگوار
گذرتا تھا۔ وہ اپنی اس حرکت پر ذرا بھی نہ پچھتاتا تھا۔ کہتا "میرے بھاگ
میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ہو گا۔ لیکن دادا کے دن سے تو اُرن ہو گیا۔ ان کی آتما
کو تو کوئی دکھ نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تو چار کو کھلا کر کھایا۔ کیا

مرنے کے بعد بھی انہیں ٹھنڈے پانی کو ترساتا۔"

اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔ اور اساڑھ آپہنچا۔ آسمان پر گھٹائیں آئیں۔ پانی گرا۔ زمین پر ہریالی آگئی۔ تال اور گڑھے لہرانے لگے۔ بڑھئی سب کسانوں کے دروازے پر آ آ کر ہلوں کی مرمت کرتا تھا۔ جوئے بناتا تھا۔ گردھاری دل مسوس کر رہ جاتا۔ پاگلوں کی طرح کبھی اندر جاتا کبھی باہر۔ اپنے ہلوں کو نکال نکال کر دیکھتا۔ اس کی مٹھیا ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی پھار ڈھیلی ہو گئی ہے۔ جوئے میں سیل نہیں ہے۔ یہ دیکھتے دیکھتے وہ ایک لمحہ کیلئے اپنے کو بھول گیا۔ دوڑا ہوا بڑھئی کے پاس گیا اور بولا۔ "رجّو! میرے ہل بھی بگڑے ہوئے ہیں۔ آج انہیں بنا دینا۔"

رجّو نے اس کی طرف رحم اور تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اپنا کام کرنے لگا۔ گردھاری کو بھی ہوش آ گیا۔ نیند سے چونک پڑا۔ شرم سے اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ چپ چاپ گھر چلا آیا۔ گاؤں میں ہر طرف ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کوئی سن کے بیج ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ کوئی زمیندار کے چوپال سے دھان کے بیج لیے آتا تھا۔ کہیں صلاح ہوتی تھی۔ کہ کھیت میں کیا بونا چاہیئے؟ کہیں چرچے ہوتے تھے کہ پانی بہت برس گیا۔ دو چار دن ٹھہر کے بونا چاہیئے۔ گردھاری سارے تماشے دیکھتا تھا۔ سارے چرچے سنتا تھا اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

(۵)

ایک دن شام کے وقت گردھاری کھڑا اپنے بیلوں کو کھجا رہا تھا۔ آجکل اس کا

بہت سا وقت بیلوں ہی کی داشت میں صرف ہوتا تھا۔ کہ منگل سنگھ آئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرکے بولے۔ "اب گھوئیں کو باندھ کر کب تک کھلاؤ گے؟ نکال کیوں نہیں دیتے؟" گردھاری نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "ہاں کوئی گاہک آجائے تو نکال دوں گا۔"

منگل سنگھ :- "ہمیں کو دے دو۔"

گردھاری نے آسمان کی طرف تاک کر کہا۔ "تمہیں لے جاؤ۔ اب یہ میرے کس کام کے ہیں؟"

ان الفاظ میں کتنی مایوسی، کتنی حسرت تھی۔ اب تک گردھاری نے ایک موہوم امید پر کسی غیبی امداد کے بھروسے پر انہیں باندھ کر کھلایا تھا۔ آج امید کا وہ خیالی تار بھی ٹوٹ گیا۔ مول جول ہوا۔ گردھاری نے دونوں بچھڑے چالیس روپیہ میں لئے تھے۔ اب وہ اسی سے کم کے نہ تھے۔ منگل سنگھ نے صرف پچاس روپے لگائے۔ لیکن گردھاری اسی پر راضی ہو گیا۔ اس کے دل نے کہا۔ جب گرہستی ہی لٹ رہی ہے۔ تو کیا دس زیادہ کیا دس کم!

منگل سنگھ نے منہ مانگی مراد پائی۔ دوڑ کر گھر سے روپیہ لائے۔

وہ گردھاری کی کھاٹ پر بیٹھے روپیہ گن رہے تھے۔ اور گردھاری بیلوں کے پاس کھڑا دردناک انداز سے ان کے منہ کی طرف تاکتا تھا۔ یہ میرے کھیتوں کے کمانے والے۔ میرے ان داتا۔ میری زندگی کے آدھار جن کے دانے اور کھلی کی اپنے کھانے سے زیادہ فکر رہتی تھی۔ جن کے لئے گھڑی رات رہے جاگ کر چارہ کاٹتا تھا۔ جن کے لئے نیچے کھیتوں کی ہریالی کاٹتے

تھے۔ یہ میری اُمیدوں کی دو آنکھیں۔ میری آرزوؤں کے دو تارے۔ میرے
اچھے دِنوں کی دو یادگاریں۔ یہ میرے دو ہاتھ اب مجھ سے رُخصت ہو
رہے تھے۔ اور بیٹھی بھر روپیوں کیلئے!

آخر منگل سنگھ نے روپے گن کر رکھ دیئے۔ اور بیلوں کو کھول کر لے چلے
تو گردھاری ان کے کندھوں پر باری باری سر رکھ کر خوب پھوٹ پھوٹ
کر رویا۔ جیسے میکے سے بدا ہوتے وقت لڑکی ماں۔ باپ کے پیروں کو نہیں
چھوڑتی۔ اسی طرح گردھاری ان بیلوں سے چمٹا ہوا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا
ہوا آدمی کسی سہارے کو پاکر اس سے چمٹ جائے۔ سبھاگی بھی دالان میں
کھڑی روتی تھی۔ اور چھوٹا لڑکا جس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ منگل سنگھ کو ایک
بانس کی چھڑی سے مار رہا تھا۔

رات کو گردھاری نے کچھ نہیں کھایا اور چارپائی پر پڑا رہا لیکن صبح
کو اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اِدھر مہینوں سے وہ کسی کے گھر نہ جاتا تھا۔
سبھاگی کو اندیشہ ہوا۔ تاہم وہ اُمید کے خلاف اُمید کرتی رہی کہ آتے
ہوں گے۔ لیکن جب آٹھ نو بجے اور وہ نہ لوٹا تو اس نے رونا دھونا شروع
کیا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ چاروں طرف کھوج ہونے لگی۔
لیکن گردھاری کا پتہ نہ چلا۔ لیکن ابھی تک آس میں کچھ جان تھی۔ اس لیئے
چوڑیاں نہ توڑیں۔ ماتم نہ کیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ سبھاگی نے
دیا لاکر گردھاری کی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا تھا۔ اور بیٹھی دروازے
کی طرف تاک رہی تھی۔ گود کی لڑکی سو رہی تھی۔ اور چھوٹا لڑکا کھانا کھا رہا تھا۔

کہ دادا کو بلوائے۔ وہ کہاں گیا ہے۔ کیوں نہیں آتا؟ کہ یکایک سہاگی کو پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ سہاگی کے کلیجہ میں مسرت کا دھماکہ ہُوا۔ دروازے کی طرف دوڑی۔ لیکن چارپائی خالی تھی۔ اُس نے باہر نکل کر جھانکا۔ اُس کا کلیجہ دھک دھک کرتا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ گردھاری بیلوں کی ناند کے پاس چپ چاپ سر جھکائے کھڑا ہوا ہے۔ سہاگی بول اُٹھی "گھر میں آؤ۔ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ سارے دن حیران کر ڈالا۔" یہ کہتی ہوئی وہ گردھاری کی طرف تیزی سے چلی۔ گردھاری نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اور تھوڑی دور جا کر غائب ہو گیا۔ سہاگی نے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی۔

اسی دن نور کے تڑکے کالکا دین مہتو ہل لے کر اپنے نئے کھیت میں پہنچے ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ وہ بیلوں کو ہل میں لگا رہے تھے۔ کہ یکایک اُنہوں نے دیکھا۔ کہ کھیت کی مینڈ پر گردھاری کھڑا ہے۔ وہی مرزائی۔ وہی پگڑی۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔

کالکا دین نے کہا کہ "اے گردھاری! مرد آدمی تم یہاں کھڑے ہو اور بیچاری سہاگی حیران ہو رہی ہے۔ کہاں سے آ رہے ہو؟" یہ کہتا ہُوا وہ بیلوں کو چھوڑ کر گردھاری کی طرف چلا۔ مگر گردھاری پیچھے ہٹنے لگا۔ اور جاتے جاتے پیچھے کی طرف والے کنوئیں میں کُود پڑا۔ کالکا دین نے چیخ ماری۔ ہل ڈل وہیں چھوڑ کر بے تحاشا گھر کی طرف بھاگے۔

لیکن اُنہوں نے اپنے ہل واہوں سے یہ راز نہ بتلایا۔ دوسرے دن اپنے ایک جھینگر ہلواہے کو اُس کھیت میں بھیجا۔ شام ہو گئی۔ سب کے ہل بیل آ گئے

لیکن جھینگر کھیت سے نہ لوٹا۔ گھڑی رات ہوئی۔ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ کالکا دین گھبرائے گاؤں کے دو، تین آدمیوں کے ساتھ کھیت میں آئے۔ دیکھا کہ دونوں بیل ایک طرف گرے ہوئے ہیں۔ اور جھینگر دوسری طرف بے سُدھ پڑا ہوا ہے۔ اسے بہت سہلایا۔ بلایا لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ دو، تین آدمی اُسے لاد کر گھر لائے۔ بیلوں کو دیکھا تو اُن کے پیروں سے خون نکل رہا تھا۔ لوگ سمجھ گئے کہ جب جھینگر گر پڑا ہوگا۔ تو دونوں بیل آپس میں کھینچا تانی کرنے لگے ہونگے۔ ہل میں جُتے تھے۔ ہی۔ پھال پیروں میں لگ گئی ہوگی۔ جھینگر رات بھر ہذیان بکتا رہا۔ صبح کو جاکر اُسے ہوش آیا۔ اُس نے کہا: "میں نے پورب والے کنوئیں کے پاس گردھاری کو کھڑے دیکھا۔ کئی بار بلایا۔ لیکن وہ نہ بولا۔ تب میں اس کی طرف چلا۔ بس وہ اس کنوئیں میں کود پڑا۔ پھر مجھے ہوش نہیں۔ کہ کیا ہوا؟"

سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا۔ طرح طرح کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن اس دن سے پھر کالکا دین کو اُن کھیتوں کے قریب جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شام ہوتے ہی اُدھر کا راستہ بند ہو جاتا۔

(۶)

اس واقعہ کو آج چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ گردھاری کا بڑا لڑکا اب اینٹ کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ اور روزانہ دس، بارہ آنہ گھر لاتا ہے۔ وہ اب قمیص اور انگریزی جوتا پہنتا ہے۔ گھر میں ترکاری دونوں وقت پکتی ہے۔ اور جوار کی جگہ گیہوں اور چاول خرچ ہوتا ہے۔ لیکن گاؤں میں اب اس کا کچھ وقار نہیں ہے وہ مجدورا سبھاگی کی تیزی اور تمکنت رخصت ہو گئی ہے۔ آگ کی چنگاری راکھ ہو گئی

ہے۔ اب وہ کسی کو کھلا نہیں سکتی۔ اُسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا منتشر کر سکتا ہے۔ پرائے
گاؤں آئے ہوئے کتے کی طرح دبکی پڑی ہے۔ وہ اب پنچایتوں میں نظر نہیں آتی
اب نہ اس کا دربار لگتا ہے۔ نہ اُسے کسی دربار میں دخل ہے۔ وہ اب مجبورے
کی ماں ہے۔ لیکن ابھی تک گردھاری کا کریا کرم نہیں ہوا۔ آس مر گئی ہے۔ مگر
اس کی یاد باقی ہے۔ کالکا دین نے اب گردھاری کے کھیتوں سے استعفےٰ دیدیا
ہے۔ کیونکہ گردھاری کی روح ابھی تک کھیتوں کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی
ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اپنے کھیتوں کو دیکھکر اُسے تسکین ہوتی
ہے۔ اوکارناتھ بہت کوشش کرتے ہیں۔ کہ زمین اُٹھ جائے۔ لیکن گاؤں کے
لوگ اب اس کی طرف تاکتے ہوئے ڈرتے ہیں ؎

  

خونِ سفید

(۱)

چیت کا مہینہ تھا۔ لیکن وہ کھلیان جہاں اناج کے سُنہرے انبار لگے تھے، جاں بلب مویشیوں کے آرامگاہ بنے ہوئے تھے۔ جن گھروں سے پھاگ اور بسنت کی الاپیں سُنائی دیتی تھیں، وہاں آج تقدیر کا رونا تھا۔ سارا چوماسا گزر گیا۔ پانی کی ایک بوند نہ گری۔ جیٹھ میں ایکبار مُوسلا دھار مینہہ برسا تھا۔ کسان پھولے نہ سماتے۔ خریف کی فصل بو دی۔ لیکن فیاض اندر نے اپنا سارا خزانہ شائد ایک ہی بار لُٹا دیا تھا۔ پودے اُگے، بڑھے اور پھر سوکھ گئے۔ مرغزاروں میں گھاس نہ جمی۔ بادل آتے۔ گھٹائیں اُمڈتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جل تھل ایک ہو جائیگا۔ مگر وہ نخوست کی نہیں۔ آرزوؤں کی گھٹائیں تھیں۔ کسانوں نے بہت جپ تپ کئے۔ اینٹ اور پتھر دیویوں کے نام سے پُج گئے۔ پانی کی اُمید میں خون کے پرنالے بہہ گئے۔ لیکن اندر کسی طرح نہ پسیجے۔ نہ کھیتوں

میں پودے تھے۔ نہ چراگاہوں میں گھاس۔ نہ تالابوں میں پانی۔ عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔ جدھر دیکھئے خستہ حالی، افلاس اور فاقہ کشی کے دل خراش نظارے دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں نے پہلے گہنے اور پھر برتن گرو رکھے اور تب نہ بیچ ڈالے۔ پھر مویشیوں کی باری آئی۔ اور جب روزی کا کوئی سہارا نہ رہا تب اپنے وطن پر جان دینے والے کسان بیوی بچوں کو لیکر مزدوری کرنے کو نکلے۔ جا بجا محتاجوں اور مزدوروں کی پرورش کے لئے سرکار کی جانب سے امدادی تعمیرات جاری ہو گئی تھیں۔ جسے جہاں سبھیتا ہوئی۔ اُدھر جا نکلا۔

(۲)

شام کا وقت تھا۔ جادو رائے تھکا ماندہ خستہ حال زمین پر بیٹھ گیا۔ اور بیوی سے مایوسانہ لہجے میں بولا۔" درخواست نامنظور ہو گئی۔"

یہ کہکر آنگن میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور آنتیں سکڑی ہوئی تھیں۔ آج دو دن سے اس نے دانے کی صورت نہیں دیکھی۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا۔ گہنے، کپڑے، برتن، بھانڈے سب پیٹ میں سما گئے۔ گاؤں کا ساہوکار نگاہِ عصمت کی طرح آنکھیں چرانے لگا۔ صرف تقاوی کا سہارا تھا۔ اس کی درخواست دی تھی۔ لیکن افسوس! وہ درخواست بھی نامنظور ہو گئی۔ اُمید کا جھلملاتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔

دلیو کی نے شوہر کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آیا ہے۔ اسے کیا کھلائے۔ شرم کے مارے وہ ہاتھ پاؤں دھونے کیلئے پانی بھی نہیں لائی۔ جب ہاتھ پاؤں

دھو کر وہ منتظر اور گرسنہ انداز سے اس کی طرف دیکھے گا، تو وہ اُسے کیا کھانے کو دیگی۔ اس نے خود کئی دن سے دانے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اس وقت اُسے جو صدمہ ہوا۔ وہ فاقہ کشی کی تکالیف سے بدرجہا سخت تھا، عورت گھر کی لکشمی ہے۔ گھر کے آدمیوں کو کھلانا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اور خواہ یہ اُس کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ناداری اور بینوائی سے جو روحانی صدمہ اُس کو ہوتا ہے۔ وہ مردوں کو نہیں ہوسکتا۔

یکایک اس کا بچہ سادھو نیند سے چونکا۔ اور مٹھائیوں کی صبر آزما خواہش سے بھرا ہوا آکر باپ سے لپٹ گیا۔ اس بچے نے آج صبح کو چنے کی روٹیوں کا ایک ٹکڑا کھایا تھا۔ اور تب سے کئی بار اُٹھا اور کئی بار روتے روتے سو گیا۔ چار برس کا نادان بچہ۔ اسے مٹھائیوں میں اور بارش میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ جادو رائے نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور اس کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی گردن جھک گئی۔ اور بیکسی آنکھوں میں سما سکی۔

(۳)

دوسرے دن یہ کنبہ بھی گھر سے نکلا۔ جس طرح مرد کے دل سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا نہیں نکلتی۔ اُسی طرح اپنی محنت سے روٹی کمانے والا کسان بھی مزدوری کی کھوج میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن فاقہ کشی! آہ تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ عزت اور غیرت۔ شرم اور حیا یہ سب چمکتے ہوئے تارے تیری سیاہ گھٹاؤں کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔

صبح کا وقت تھا۔ یہ دونوں غم نصیب گھر سے نکلے۔ جادو والے نے لڑکے کو بیٹھے پہ لیا۔ دلو کی نے وہ بینوائی کی گٹھڑی سر پہ رکھی۔ جس پر افلاس کو ترس آتا۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ دیو کی روتی تھی۔ جادو خاموش تھا۔ گاؤں کے دو چار آدمیوں سے راستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔ مگر کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا۔ کہ کہاں جاتے ہو کسی کے دل میں ہمدردی باقی نہ تھی۔

سورج ٹھیک سر پہ تھا۔ جب یہ لوگ لال گنج پہنچے۔ دیکھا تو میلوں تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ لیکن ہر ایک چہرے پر فاقہ کشی اور مصیبت کا ایک دفتر تھا۔ بیساکھ کی وہ جلتی ہوئی دھوپ۔ آگ کے جھونکے زور زور سے ہر ہراتے ہوئے چلتے تھے۔ اور وہاں ہڈیوں کے بے شمار ڈھانچے جن کے بدن پر جامۂ عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا۔ مٹی کھودنے میں مصروف تھے۔ گویا مرگھٹ تھا۔ جہاں مردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے۔

بوڑھے اور جوان، مرد اور بچے سب کچھ اس بیکسانہ ہمت اور یاس سے کام میں لگے ہوئے تھے۔ گویا موت اور فاقہ کشی ان کے سامنے بیٹھی ہوئی گھور رہی ہے۔ اس آفت میں نہ کوئی کسی کا دوست تھا اور نہ ہمدرد، رحم، شرافت اور اخلاق یہ سب انسانی جذبات ہیں، جن کا خالق انسان ہے۔ قدرت نے جانداروں کو صرف ایک خاصیت عطا کی ہے اور وہ خود غرضی ہے۔ انسانی جذبات جو فارغ البالی کے سنگار ہیں، اکثر بےوفا دوستوں کی طرح ہم سے دغا کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ فطری خاصیت دم آخر تک ہمارا گلا نہیں چھوڑتی ۔

(۷)

آٹھ دن گزر گئے تھے۔ شام کا وقت تھا کیمپ کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کیمپ سے کچھ دور آم کا ایک گھنا باغ تھا۔ وہیں ایک پیڑ کے نیچے جادو رائے اور دیوکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ایسے خستہ حال تھے۔ کہ ان کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ وہ آزاد کاشتکار نہیں رہے۔ وہ اب فاقہ کش مزدور ہو گئے ہیں۔

جادو رائے نے بچے کو زمین پر سُلا دیا۔ اُسے کئی دن سے بخار آ رہا ہے کنول سا چہرہ مُرجھا گیا ہے۔ دیوکی نے اُسے آہستہ سے ہلا کر کہا۔ "بیٹا، آنکھیں کھولو۔ دیکھو سانجھ ہو گئی ہے۔"

سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ بخار اُتر گیا تھا۔ بولا۔ "کیا ہم گھر آ گئے ماں؟"

گھر کی یاد آ گئی۔ دیوکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے کہا۔ "نہیں بیٹا! تم اچھے ہو جاؤ گے۔ تو گھر چلیں گے۔ اُٹھ کر دیکھو کیسا اچھا باغ ہے۔"

سادھو ماں کے ہاتھوں کے سہارے اُٹھا۔ اور بولا۔ "اماں مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ لیکن تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ مجھے کیا کھانے کو دو گی؟"

دیوکی کے کلیجے پر چوٹ لگی۔ ضبط کر کے بولی۔ "نہیں بیٹا! تمہارے کھانے کو میرے پاس سب کچھ ہے۔ دادا پانی لاتے ہیں۔ تو میں نرم نرم روٹیاں بنائے دیتی ہوں۔"

سادھو نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ اور بولا۔ "اماں میں نہ ہوتا۔ تو تمہیں

اتنا دکھ نہ ہوتا"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ وہی بے سمجھ بچہ ہے، جو دو ہفتہ پہلے مٹھائیوں کیلئے دنیا سر پر اٹھا لیتا تھا۔ افلاس نے اور فکر نے کیسا تغیّر کر دیا ہے۔ یہ مصیبت کے احساس کا اثر ہے۔ کتنا دردناک، کتنا دل شکن!

اسی اثنا میں کئی آدمی لالٹین لئے ہوئے وہاں آ گئے۔ پھر گاڑیاں آئیں۔ اُن پر ڈیرے اور خیمے لدے ہوئے تھے۔ دم کے دم میں وہاں خیمے کھڑے ہو گئے۔ سارے باغ میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ ڈیرے کی رونقیں سنیک رہی تھیں۔ سادھو دھیرے دھیرے اُٹھا اور حیرت سے تاکتا ہوا ایک ڈیرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔

(۵)

پادری موہن داس خیمے سے باہر نکلے تو سادھو اُنہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر انہیں ترس آ گیا۔ محبّت کا دریا اُمڈ آیا۔ بچّے کو گود میں اُٹھا لیا اور خیمے میں لا کر ایک گدّے دار کوچ پر بٹھایا۔ تب اُسے بسکٹ اور کیلے کھانے کو دیئے۔ لڑکے نے اپنے بہترین زمانے میں ان نعمتوں کی صورت نہ دیکھی تھی۔ بخار کی بے چین کرنے والی بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور تب احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پادری صاحب کے پاس جا کر بولا۔ "تم ہم کو روز ایسی چیز کھلاؤ گے؟"

پادری صاحب اس بھولے پن پر مسکرا کر بولے۔ "میرے پاس اس سے بھی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔" اس پر سادھو رام نے کہا۔ "اب میں روز تمہارے

ساتھ رہوں گا۔ اماں کے پاس ایسی چیزیں کہاں ہیں۔ وہ تو مجھے چنے کی روٹیاں کھلاتی ہے۔"

ادھر دیو کی نے روٹیاں بنائیں اور سادھو کو پکارنے لگی۔ سادھو نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ "مجھے صاحب نے اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دی ہیں صاحب بڑے اچھے ہیں۔"

دیو کی نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے نرم نرم روٹیاں پکائی ہیں۔ آؤ تمہیں کھلاؤں۔"

سادھو بولا۔ "اب میں نہ کھاؤں گا۔ صاحب کہتے تھے۔ کہ میں تمہیں روز اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گا۔ میں اب اُن کے ساتھ رہونگا۔"

ماں نے سمجھا لڑکا ہنسی کر رہا ہے۔ اسے چھاتی سے لگا کر بولی۔ "کیوں بیٹا! ہم کو بھول جاؤ گے۔ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں؟"

سادھو طفلانہ متانت سے بولا۔ "تم تو مجھے روز چنے کی روٹیاں دیتی ہو۔ تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ صاحب مجھے کیلے اور آم کھلائیں گے" یہ کہہ کر وہ پھر خیمے کی طرف بھاگا۔ اور رات کو وہیں سو رہا۔

پادری موہن داس کا وہاں تین دن قیام رہا۔ سادھو دن بھر انہیں کے ساتھ رہتا۔ صاحب نے اسے میٹھی میٹھی دوائیں دیں۔ اس کا بخار جاتا رہا۔ وہ بھولے بھالے کسان صاحب کو دعائیں دیتے۔ بچہ چنگا ہے۔ اور آرام سے ہے۔ صاحب کو پرماتما سدا سکھی رکھے۔ انہوں نے بچے کی جان رکھ لی۔

چوتھے دن رات کو ہی پادری صاحب نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور صبح کو دیو کی اُٹھی۔ تو سادھو کا بھی وہاں پتہ نہ تھا۔ دیو کی نے سمجھا۔ کہیں ٹیکے ڈھونڈنے گیا ہوگا۔ اس نے جادو سے کہا۔ یہاں للّو نہیں ہے اس نے بھی یہی کہا۔ کہیں ٹیکے ڈھونڈتا ہوگا۔

لیکن جب سورج نکل آیا۔ اور کام پر چلنے کا وقت آپہنچا۔ تب جادو رائے کو کچھ اندیشہ ہوا۔ اس نے کہا کہ "تم یہیں بیٹھی رہنا۔ میں ابھی اُسے لئے آتا ہوں"

اُس نے قرب وجوار کے سب باغ چھان ڈالے۔ اور دس بجتے بجتے ناکام لوٹ آیا۔ سادھو نہ ملا۔ دیو کی نے زار زار رونا شروع کیا۔

پھر دونوں اپنے لال کی تلاش میں نکلے۔ طرح طرح کے وسواس دل میں آتے تھے۔ دیو کی کو پورا یقین تھا کہ صاحب نے اس پر کوئی منتر ڈال دیا۔ لیکن جادو کو اس مظنّہ کے تسلیم کرنے میں کچھ خفیف سا شک تھا۔ بچہ اتنی دُور انجان راستے پر اکیلا نہیں جا سکتا۔ تاہم دونوں گاڑی کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان دیکھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سڑک پر آپہنچے۔ وہاں گاڑی کے بہت سے نشان تھے۔ ایک خاص لیک کی تمیز نہ ہو سکی۔ گھوڑے کی ٹاپ بھی ایک جھاڑی کی طرف جاکر غائب ہو گئی۔ اُمید کا سہارا ٹوٹ گیا۔ دوپہر ہوگئی تھی۔ دونو دھوپ کے مارے بے چین۔ مایوسی سے نیم جان ہو گئے تھے۔ وہیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ دیو کی بلاپ کرنے لگی۔ جادو نے غمگساری کا فرض

ادا کرنا شروع کیا۔

جب دھوپ کی تیزی ذرا کم ہوئی تو دونوں پھر آگے چلے لیکن اب اُمید کی بجائے مایوسی ساتھ تھی۔ گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ اُمید کا دُھندلا نشان غائب ہو گیا تھا۔

شام ہو گئی۔ جا بجا مویشی موت کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ یہ دونوں مصیبت کے مارے ہمت ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اسی درخت پر فاختہ کا ایک جوڑا بسیرا لئے ہوئے تھا۔ اُن کا ننھا سا بچہ آج ایک شکرے کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ دونوں دن بھر بے چین اِدھر اُدھر اڑتے رہے۔ اس وقت ہمت ہار کر بیٹھ رہے۔ مایوسی نے تشفی دی۔ اُمید میں اضطراب اور بے کلی ہے۔ مایوسی میں تشفی و تسکین دلوں کی اور رجاد و کی مایوسی میں بھی اُمید کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے وہ بے چین تھے۔

تین دن تک یہ دونوں اپنے کھوئے ہوئے لال کی تلاش کرتے رہے دانہ سے بھینٹ نہیں۔ پیاس سے بے چین ہوتے۔ تو پانی کے دو چار گھونٹ حلق کے نیچے اتار لیتے۔ اُمید کی بجائے مایوسی کا سہارا تھا۔ ہمت کی بجائے بے ہمتی کا ساتھ۔ اشک اور غم کے سوا کوئی زادِ راہ نہیں کسی بچے کے پاؤں کے نشان دیکھتے۔ تو ان کے دلوں میں اُمید و بیم کا ایک طوفان سا اُٹھ جاتا۔

لیکن ہر قدم انہیں منزلِ مقصود سے دُور لئے جاتا تھا۔

(۶)

اس واقعہ کو چودہ سال گزر گئے۔ اور متواتر چودہ سال ملک میں رام کا راج رہا، نہ کبھی اندر نے شکایت کا موقع دیا، اور نہ زمین نے اُمڈی ہوئی ندی کی طرح انبار خانے غلّے سے لبریز تھے۔ اُجڑے ہوئے گاؤں آباد ہو گئے۔ مزدور کسان ہو بیٹھے اور کسان جائیداد کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔

وہی چیت کے دِن تھے۔ کھلیانوں میں سُنہرے اناج کے پہاڑ کھڑے تھے۔ بھاٹ اور بھکاری کسانوں پر دنیا کی نعمتوں کی بارش کرتے نظر آتے تھے۔ سُناروں کے دروازے پر سارے دن اور آدھی رات تک گاہکوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ درزی کو سر اُٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ اکثر دروازوں پر گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ اور دیوی کے پجاریوں کو بدہضمی کا مرض ہو گیا تھا۔

زمانے نے جادورائے کے ساتھ بھی مساعدت کی۔ اس کے گھر پر اب بجائے کھپریل کے پکّی چھت تھی۔ دروازے پر خوش قامت بیلوں کی جوڑی بندھی ہوتی ہے۔ وہ اب اپنی بہلی میں سوار ہو کر بازار جایا کرتا ہے۔ اس کا جسم اب اتنا سڈول نہیں ہے۔ پیٹ پر فارغ البالی کا خاص اثر نظر آتا ہے۔ اور بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔ دیوکی کا شمار بھی گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں میں ہوتا ہے۔ اور نسوانی مناقشات میں اکثر اس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی پڑوسن کے گھر جاتی ہے، تو

دہاں کی بہوئیں خوف سے تھر تھرانے لگتی ہیں۔ اس کی نگاہ تیز اور زبان شعلہ ریز کی سارے گاؤں میں دھاک بندھی ہوئی ہے۔ جھین کپڑے اب اسے نہیں بھاتے لیکن گہنوں کے بارے میں وہ اتنی کفائیت شعار نہیں ہے۔

اُن کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے کم روشن نہیں ہے۔ ان کے دو اولادیں ہیں۔ لڑکا مادھو سنگھ اب کھیتی باڑی کے کام میں باپ کی مدد کرتا ہے۔ لڑکی کا نام شیو گوری ہے۔ وہ اب ماں کے ساتھ چکی پیستی ہے۔ اور خوب گاتی ہے۔ برتن دھونا اسے پسند نہیں۔ لیکن چوکا لگانے میں مشتاق ہے۔ اس کی گڑیوں کا کبھی بیاہ سے جی نہیں بھرتا۔ آئے دن شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں ان میں کفائیت کا کامل لحاظ رکھا جاتا ہے۔

گم گشتہ سادھو کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اس کا ذکر اکثر آتا ہے۔ اور کبھی رُلائے بغیر نہیں رہتا۔ دیوکی کبھی کبھی دِن دن بھر اُس لاڈلے بیٹے کی سُدھ میں بیقرار رہتی ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ بیل دِن بھر کے تھکے سر جھکائے چلے آتے ہیں۔ پجاریوں نے ٹھاکر دوارے میں گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ آج کل فصل کے دن ہیں۔ روز پوجا ہوتی ہے۔ جادو رائے کھاٹ پر بیٹھے ناریل پی رہے تھے۔ شیو گوری راستے میں کھڑی بیلوں کو کوس رہی تھی۔ جو اس کے عالیشان محل کی ذرا بھی عزت نہ کر کے اُسے روندتے چلے جاتے تھے۔

ناقوس اور گھنٹے کی آواز سنتے ہی جادو رائے چرنامرت لینے کے لئے اُٹھے۔ کہ یکایک ایک شریف صورت خوش رو نوجوان بھونکتے ہوئے

کتوں کو دھتکارتا ۔ بائیسکل کو ہاتھوں سے دھکیلتا ان کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ اور جھک کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا ۔ جادو رائے نے غصہ سے دیکھا اور تب دونوں لپٹ گئے ۔ مادھو بھوچکا ہو کر بائیسکل کو دیکھنے لگا ۔ شیو گوری روتی ہوئی گھر میں بھاگ گئی اور دیوکی سے بولی ۔ دادا کو صاحب نے پکڑ لیا ہے ۔ دیوکی گھبرائی ہوئی باہر آئی ۔ مادھو اُسے دیکھتے ہی اُس کے پاؤں پر گر پڑا ۔ دیوکی لڑکے کو چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگی ۔ گاؤں کے مرد اور عورتیں اور بچے جمع ہو گئے ۔ میلہ سا لگ گیا ۔

(۷)

مادھو نے کہا ۔" ماتا جی اور پتا جی ! مجھ بدنصیب سے کچھ قصور ہوا ہو تو اُسے مُعاف کیجیئے ۔ میں نے اپنی نادانی سے خود بہت تکلیفیں اُٹھائیں ۔ اور آپ کو بہت دُکھ دیا ۔ لیکن اب مجھے اپنی گود میں لیجیئے ۔"

دیوکی نے رو کر کہا ۔" جب تم ہم کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ۔ تو ہم لوگ تین دن تک بے دانہ بے پانی ڈھونڈتے رہے ۔ جب نراس ہو گئے ۔ تو اپنے نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہے ۔ تب سے آج تک کوئی ایسا دن نہ گیا ہوگا ۔ کہ تمہاری سُدھ نہ آئی ہو ۔ روتے روتے ایک جُگ بیت گیا ۔ اب تم نے جا کر خبر لی ہے ۔ بتاؤ بیٹا اس دن تم کیسے بھاگے ۔ اور کہاں جا کر رہے ؟"

مادھو نے ندامت آمیز محبت سے جواب دیا ۔" ماتا جی ! اپنا حال کیا کہوں ۔ میں پہر رات رہے آپ کے پاس سے اُٹھ کر بھاگا ۔ پادری صاحب کے پڑاؤ کا پتہ شام ہی کو پوچھ لیا تھا ۔ بس پوچھتا پوچھتا دوپہر کو ان کے پاس پہنچ گیا صاحب نے مجھے سمجھایا کہ اپنے گھر لوٹ جاؤ ۔ لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوا ۔ تو

اُنھوں نے مجھے پُونا بھیج دیا۔ میری طرح وہاں سینکڑوں لڑکے تھے۔ وہاں بسکٹ اور نارنگیوں کا کیا ذکر۔ اب مجھے آپ لوگوں کی یاد آئی۔ اور میں اکثر روتا، مگر بچپن کی عمر تھی۔ دھیرے دھیرے انھیں لڑکوں میں ہل مل گیا۔ لیکن جب سے ہوش آیا ہے۔ اور اپنا پرایا سمجھنے لگا ہوں، تب سے اپنی نادانی پر ہاتھ ملتا رہا ہوں۔ رات اور دن آپ لوگوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ آج آپ لوگوں کی دُعا سے وہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔ بیگانوں میں بہت دن کاٹے۔ بہت دن تک اناتھ رہا۔ اب مجھے اپنی سیوا میں رکھیے۔ مجھے اپنی گود میں لیجیے۔ میں محبت اور پیار کا بھوکا ہوں۔ مدتوں سے مجھے یہ نعمت میسر نہیں ہوئی۔ وہ نعمت مجھے دیجیے۔"

گاؤں کے بہت سے بزرگ جمع تھے۔ بوڑھے جگن سنگھ بولے: "تو کیوں بیٹا! تم اتنے دِنوں پادریوں کے ساتھ رہے۔ انھوں نے تم کو بھی پادری بنا لیا ہوگا؟"

سادھو نے سر جھکا کر کہا: "جی ہاں یہ تو اُن کا دستور ہی ہے۔"

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ بڑی کٹھن بات ہے۔"

سادھو بولا: "برادری مجھ سے جو پرائشچت کرائیگی۔ میں اُسے شوق سے پُورا کروں گا۔ مجھ سے جو کچھ برادری کا اپرادھ ہوا ہے۔ نادانی میں ہوا ہے لیکن میں اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

جگن سنگھ نے پھر جادو رائے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اور دور اندیشانہ انداز سے بولے: "ہندو دھرم میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ یہاں تمہارے باپ اور ماں چاہے تمہیں اپنے گھر میں رکھ لیں۔ تم اُن کے لڑکے ہو۔ مگر برادری کبھی اس کام میں شریک نہ ہوگی۔ بولو جادو رائے! کیا کہتے ہو۔ کچھ تمہارے من کی

بات بھی تو معلوم ہو۔

جادو رائے بڑے دُبدھے میں پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف تو اپنے پیالے بیٹے کی محبت کھینچتی تھی اور دوسری طرف برادری کا خوف دامنگیر تھا۔ جس لڑکے کے لیئے منتیں مانتے مدتیں گزر گئیں۔ آج وہی کھڑا سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے کہتا ہے: "پتاجی! مجھے اپنی گود میں لیجیئے" اور میں پتھر کے دیوتا کی طرح خاموش بیٹھا ہوا ہوں۔ افسوس! ان بیرحم بھائیوں کو کیا کروں، کیسے سمجھاؤں"؟

لیکن ماں کی مامتا نے جوش مارا۔ دیوکی سے ضبط نہ ہوا۔ اس نے بلیا کی سے کہا: "میں اپنے لال کو اپنے گھر میں رکھوں گی۔ اور کلیجے سے لگاؤں گی۔ اتنے دنوں کے بعد ہم نے اُسے پایا ہے۔ اب اُسے نہیں چھوڑ سکتی"۔

جگن سنگھ تیز ہو کر بولے: "چاہے برادری چھوٹ جائے"؟

دیوکی نے بھی تیز ہو کر جواب دیا: "ہاں چاہے برادری چھوٹ جائے لڑکے بالوں کیلئے ہی آدمی برادری کی آڑ پکڑتا ہے۔ جب لڑکا ہی نہ رہا تو برادری ہمارے کس کام آئے گی"؟

اس پر ٹھاکر لال لال آنکھیں نکال کر بولے: "ٹھکرائین! برادری کی خوب مرجاد کرتی ہو۔ لڑکا چاہے کسی راستے پر جائے۔ لیکن برادری چوں نہ کرے۔ ایسی برادری کہیں اور ہو گی۔ ہم صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر یہ لڑکا تمہارے گھر میں رہا، تو برادری بھی بتا دے گی۔ کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے"۔

جگن سنگھ کبھی کبھی جادو رائے سے قرض دام لیا کرتے تھے مصلحت آمیز لہجے میں بولے: "بھابھی! برادری یہ تھوڑا ہی کہتی ہے۔ کہ تم لڑکے کو گھر سے نکال

دو۔ لڑکا اتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے۔ ہمارے سر اور آنکھوں پر ہے۔ بس ذرا کھانے پینے اور چھوت چھات کا بچاؤ رہنا چاہیے۔ بولو جادو بھائی اب برادری کو کہاں تک دبانا چاہتے ہو؟"

جادو داسے نے سادھو کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھکر کہا "بیٹا! جہاں تم نے ہمارے ساتھ اتنا سلوک کیا ہے۔ وہاں جگن بھائی کی بات اور مان لو۔"

سادھو نے کسی قدر نا ملائم لہجے میں کہا "کیا مان لوں۔ یہی کہ اپنوں میں غیر بنکر رہوں۔ ذلت اٹھاؤں۔ مٹی کا گھڑا ابھی میرے چھونے سے ناپاک ہو جائے۔ نہ! یہ میری ہمت سے باہر ہے۔ میں اتنا بے حیا نہیں ہوں۔"

جادو داسے کو لڑکے کی یہ سخت گیری ناگوار گزری۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ اس وقت برادری کے لوگ جمع ہیں۔ ان کے سامنے اس طرح سمجھوتہ ہو جائے۔ پھر کون دیکھتا ہے۔ کہ ہم اسے کس طرح رکھتے ہیں۔ چڑھ کر بولے "اتنی بات تو تمہیں ماننی ہی پڑیگی۔"

سادھو داسے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے۔ باپ کی اس بات میں انہیں بے دردی کا رنگ نظر آیا۔ بولے "میں آپکا لڑکا رہوں گا۔ آپکی محبت اور شفقت کی آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے۔ میں اپنے گھر میں رہنے آیا ہوں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے۔ تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ جن کے خون سفید ہو گئے ہیں۔ ان کے درمیان رہنا فضول ہے۔"

دیو کی نے رو کر کہا۔ "للو! میں تمہیں اب نہ جانے دوں گی۔"
سادھو کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن مسکرا کر بولا۔ "میں تو تیسری تھالی میں کھاؤں گا۔"

دیو کی نے اس کی طرف مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں اُٹھائیں۔ اور بولی۔ "میں نے تو تجھے چھاتی سے دودھ پلایا ہے۔ تو میری تھالی میں کھائے تو کیا، میرا بیٹا ہی تو ہے۔ کوئی اور تو نہیں ہو گیا۔"

سادھو ان باتوں کو سن کر متوالا ہو گیا۔ ان میں کتنا پیار، کتنا اپنا پن تھا۔ بولا۔ "اماں آیا تو میں اسی ارادے سے تھا۔ کہ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن میرا دردی میرے سبب سے تمہیں ہٹا کر دیا۔ تو مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ مجھ سے ان گنواروں کا غرور برداشت نہ ہو گا۔ اس لئے اس وقت مجھے جانے دو۔ جب مجھے موقع ملے گا۔ تمہارے درشن کرنے آیا کروں گا۔ تمہاری محبت میرے دل سے مٹ نہیں سکتی۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے۔ کہ میں اس گھر میں رہوں تو الگ کھانا کھاؤں۔ اور الگ بیٹھ کر۔ اس لئے مجھے معاف کرنا۔"

دیو کی گھر میں سے پانی لائی۔ سادھو ہاتھ منہ دھونے لگا۔ شیو گوری نے ماں کا اشارہ پایا۔ تو ڈرتے ڈرتے سادھو کے پاس گئی۔ سادھو نے ادب سے ڈنڈوت کی۔ سادھو نے پہلے ان دونوں کو تعجب سے دیکھا۔ پھر اپنی ماں کو مسکراتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ دونوں لڑکوں کو چھاتی سے لگایا۔ اور تینوں بھائی بہن پریم سے ہنستے کھیلنے لگے۔ ماں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھتی تھی۔ اور اُمنگ سے پھولی نہ سماتی تھی۔

جلپان کر کے سادھو نے بائیسکل سنبھالی اور ماں باپ کے سامنے سر جھکا کر چل کھڑا ہوا، وہیں جہاں سے وہ بیزار ہو کر آیا تھا۔ اسی دائرے میں جہاں سب بیگانے تھے، کوئی اپنا نہ تھا۔

دیوی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور جادو رائے آنکھوں میں آنسو بھرے جگر میں ایک اینٹھن سی محسوس کرتا ہوا سوچتا تھا۔ ہائے! میرا لال کیوں مجھ سے الگ ہوا جاتا ہے۔ ایسا لائق اور ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور صرف اس لیے کہ ہمارے خون اب سفید ہو گئے ہیں۔

  

پچھتاوا

(۱)

پنڈت درگا ناتھ جب کالج سے نکلے تو کسب معاش کی فکر دامنگیر ہوئی
رحم دل اور با اصول آدمی تھے۔ ارادہ تھا کہ کام ایسا کرنا چاہیئے جس میں اپنی
گزران بھی ہو اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور دلسوزی کا بھی موقعہ ملے۔
سوچنے لگے۔ اگر کسی دفتر میں کلرک بن جاؤں تو اپنی گزر تو ہو سکتی ہے۔ لیکن
عوام سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔ وکالت میں شریک ہو جاؤں تو دونوں باتیں ممکن
ہیں۔ مگر ہزار احتیاط کرنے پر بھی دامن کو صاف رکھنا مشکل ہوگا۔ پولیس کے
محکمہ میں غربا پروری کے بے انتہا موقعے ہیں۔ مگر وہاں کی آب و ہوا آزاد
منش اور نیک نیت آدمی کیلئے ناموافق ہے۔ مال کے صیغہ میں قاعدہ اور
قانون کی گرم بازاری ہے۔ بے لوث رہنے پر بھی سختی اور جبر سے محترز رہنا غیر
ممکن ہے۔ اس طرح بہت غور و فکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ کسی زمیندار

کے یہاں مختارِ عام بن جانا چاہیئے۔ تنخواہ تو ضرور کم ملے گی۔ مگر غریب کاشتکاروں سے رات دِن کا تعلق رہے گا۔ حسنِ سلوک کے موقعے ملیں گے۔ سادگی کی زندگی بسر ہو گی۔ ارادہ مضبوط ہو گیا۔

کنور بشال سنگھ ایک صاحب ثروت زمیندار تھے۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مجھے بھی اپنے نمک خواروں کے زُمرہ میں شامل کر لیجئے۔ کنور صاحب نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولے۔ "پنڈت جی! مجھے آپ کو اپنے یہاں رکھنے سے بڑی خوشی ہوتی۔ مگر آپ کے لائق میرے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

درگا ناتھ نے کہا۔ "میرے لئے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہر ایک کام کرنے کو تیار ہوں۔ تنخواہ جو کچھ آپ بخوشی دیجیئے۔ وہ مجھے منظور ہے میں نے تو ارادہ کر لیا ہے۔ کہ سوا کسی رئیس کے اور کسی کی نوکری نہ کروں گا۔" کنور بشال سنگھ نے مغرورانہ انداز سے فرمایا۔ رئیس کی نوکری۔ نوکری نہیں ریاست ہے۔ میں اپنے چپراسیوں کو دو روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ اور وہ تنزیب کی اچکن پہن کر نکلتے ہیں۔ دروازوں پر گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ میرے کارندے پانچ روپے سے زیادہ نہیں پاتے۔ لیکن شادی بیاہ وکیلوں کے خاندان میں کرتے ہیں۔ معلوم نہیں اُن کی کمائی میں کیا برکت ہوتی ہے۔ برسوں تنخواہ کا حساب نہیں کرتے۔ کتنے ہی ایسے ہیں۔ جو بلا تنخواہ کے کارندگی یا چپراس گری کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ مگر اپنا یہ اصول نہیں۔ سمجھ لیجئے۔ مختارِ عام اپنے علاقہ میں زمیندار سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ وہی رعب۔ وہی حکومت

وہی شان۔ جسے اس نوکری کا چسکا لگ چکا ہے۔ اس کے سامنے تحصیلدار کی کیا حقیقت ہے۔"

پنڈت درگا ناتھ نے کنور صاحب کی تائید نہیں کی۔ جیسا کہ کرنا اُن کا فرض تھا۔ دُنیاداری میں ابھی کچے تھے۔ بولے "مجھے اب تک کسی رئیس کی نوکری کا چسکا نہیں لگا ہے۔ میں تو ابھی کالج سے نکلا آتا ہوں۔ اور نہ میں ان وجوہ سے یہ نوکری کرنی چاہتا ہوں۔ جو آپ نے فرمائے۔ مگر اتنے قلیل مشاہرہ میں میرا گزر نہ ہوگا۔ آپ کے اور ملازم آسامیوں کا گلا دباتے ہوں گے۔ مجھ سے مرتے دم تک یہ فعل نہ ہوں گے۔ اگر ایماندار نوکر کی قدر ہوتی ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد مجھ سے خوش ہو جائیں گے۔"

کنور صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔ "بیشک ایماندار آدمی کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ لیکن میرے یہاں زیادہ تنخواہ دینے کی گنجائش نہیں ہے۔"

زمیندار کی اس ناقدری پر کسی قدر ترش رو ہو کر پنڈت جی نے جواب دیا۔ "تو پھر مجبوری ہے۔ اس تکلیف دہی کیلئے معاف فرمائیے گا۔ مگر میں آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ ایماندار آدمی اتنا سستا نہ ملے گا۔"

کنور صاحب نے دل میں سوچا کہ آخر کچہری عدالت روز ہوتی ہی رہتی ہے۔ سینکڑوں روپے تجویزوں اور فیصلوں کے ترجمے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ایک انگریزی داں آدمی ملتا ہے۔ بالکل سادہ لوح۔ کچھ زیادہ تنخواہ دینی پڑے گی۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر پنڈت جی کی بات کا جواب دینا ضروری تھا۔ بولے۔ "مہاراج ایماندار آدمی ایماندار ہی رہیگا۔ چاہے اُسے تنخواہ کبھی

ہی حکم دیجئے۔ اور نہ زیادہ تنخواہ پانے سے بے ایمان ایماندار بن سکتا ہے۔ ایمان کا روپیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ایماندار چپراسی دیکھے ہیں۔ اور بے ایمان ہائیکورٹ کے جج۔ لیکن خیر آپ ہونہار آدمی ہیں۔ میرے یہاں شوق سے رہیئے۔ میں آپکو ایک علاقہ کا مختار بنا دوں گا۔ آپکا کام دیکھ کر ترقی بھی کر دوں گا۔"

درگا ناتھ بیس روپیہ ماہوار پر راضی ہو گئے۔ وہاں سے ڈھائی میل پر کنور صاحب کے کئی موضع چاند پار کے علاقہ کے نام سے مشہور تھے۔ پنڈت جی اس علاقہ کے مختار عام مقرر ہوئے۔

(۲)

درگا ناتھ چاند پار کے علاقہ میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ واقعی جیسا کنور صاحب کہتے تھے۔ ریاست کی نوکری بجائے خود ریاست ہے۔ رہنے کے لئے خوبصورت بنگلہ۔ فرش فروش سے سجا ہوا۔ سینکڑوں بیگھے کی سیر کئی نوکر، کئی چپراسی۔ سواری کیلئے ایک خوبصورت ٹانگن۔ آسائش اور تکلف کے سب سامان موجود۔ مگر انہیں یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اسی سجے ہوئے بنگلہ کے چاروں طرف کاشتکاروں کے جھونپڑے تھے۔ پھونس کے بنے ہوئے۔ جن میں مٹی کے برتنوں کے سوا اور کوئی اثاثہ نہ تھا۔ بنگلہ وہاں کے عرف عام میں کوٹ مشہور تھا۔ لڑکے بھی ہوئی آنکھوں سے برآمدے کو دیکھتے مگر اوپر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی اس افلاس کے درمیان ثروت اور تمول کا یہ نظارہ اُن کیلئے نہایت دل

شکن تھا۔ کاشتکاروں کی یہ حالت کہ سامنے آتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے۔
چپراسی لوگ اُن سے بلا تو تکار کے بات نہ کرتے تھے۔
پہلے ہی دن گئی سو کاشتکاروں نے پنڈت جی کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ مگر انہیں کتنا تعجب ہوا۔ جب اُن کے نذرانے واپس کر دیے گئے۔ کاشتکار تو خوش ہوئے مگر چپراسیوں کے خون اُبلنے لگے۔ نائی اور کہار خدمت کیلئے آئے۔ وہ لوٹا دیے گئے۔ گوالوں کے گھروں سے دودھ کا ایک بھرا ہوا مٹکا آیا۔ وہ بھی واپس ہوا۔ تمبولی ایک ڈھولی پان لیکر آیا۔ مگر اس کی نذر بھی قبول نہ ہوئی۔ اسامیوں نے آپس میں کہا۔ یہ کوئی دھرماتما آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بے ضابطگیاں کیونکر برداشت ہوتیں۔ انہوں نے کہا۔ حضور اگر آپکو یہ چیزیں پسند نہ ہوں۔ تو نہ لیں۔ مگر رسم کو تو نہ مٹائیں۔ اگر کوئی دوسرا آدمی یہاں آئیگا تو اُسے نئے سرے سے یہ رسوم باندھنے میں کتنی دقت ہوگی۔ پنڈت جی نے اس نیک صلاح کا صرف اتنا جواب دیا۔ "جس کے سر جیسی پڑے گی آپ بھگت لیگا۔ مجھے ابھی سے اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
ایک چپڑاسی نے جرأت کر کے کہا۔ "ان اسامیوں کو آپ جتنا غریب سمجھتے ہیں۔ اتنے غریب نہیں ہیں۔ ان کا ڈھنگ ہی ایسا ہے بھیس بنائے رہتے ہیں۔ دیکھنے میں ایسے سیدھے سادے گویا بے سینگ کی گائے ہیں۔ مگر سچ مانیے۔ ان میں کا ایک ایک ہائیکورٹ کا وکیل ہے۔"
مگر چپراسیوں کی اس بحث کا پنڈت جی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے

ہر ایک کاشتکار سے ہمدردانہ اور برادرانہ برتاؤ شروع کیا۔ صبح ۹ بجے تک غریبوں کو مفت دوائیں دیتے۔ پھر حساب کتاب کا کام دیکھتے اُن کے اخلاق نے اسامیوں کو موہ لیا۔ مالگذاری کا روپیہ جس کے لئے ہر سال قرقی اور نیلام کی ضرورت ہوتی تھی۔ امسال ایک اشارہ سے پر وصول ہو گیا۔ کسانوں نے اپنے بھاگ سراہے۔ اور منانے لگے۔ کہ ہمارے سرکار کی کبھی بدلی نہ ہو۔"

(۳)

کنور بال سنگھ اپنی رعایا کی پرورش کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بیج کے لئے اناج دیتے۔ مزدوری اور بیل کیلئے روپے۔ فصل کٹنے پر ایک کا ڈیڑھ وصول کر لیتے۔ جیسا کہ مناسب تھا۔ چاند اپار کے علاقے میں کتنے ہی آسامی اُن کے مقروض تھے۔ چیت کا مہینہ تھا۔ فصل کچھ کھلیان میں تھی۔ کچھ گھر میں آ چکی تھی۔ کنور صاحب نے چاند اپار والوں کو بلایا۔ اور کہا۔ کہ ہمارا اناج اور روپیہ بیباق کر دو۔ چیت آ گیا۔ جب تک سختی نہ کی جائے۔ تم لوگ ڈکار تک نہیں لیتے۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔

بوڑھے ملوکا نے کہا۔ "سرکار آسامی کبھی اپنے مالک سے بیباق ہو سکتا ہے؟ کچھ ابھی لے لیا جائے۔ کچھ پھر دے دیں گے۔ ہماری گردن تو سرکار کی مٹھی میں ہے۔"

کنور صاحب نے فرمایا۔ "آج کوڑی کوڑی چکا کر تب یہاں سے اُٹھنے پاؤ گے۔ تم لوگ ہمیشہ اسی طرح حیلہ حوالہ کرتے رہتے ہو۔"

ٹلوکا نے منت کر کے کہا۔ "ہمارا پیٹ ہے سرکار کی روٹیاں ہیں۔ ہم کو اور کیا چاہیئے۔ جو کچھ اُپج ہے۔ وہ سب سرکار ہی کی تو ہے۔"

کنور صاحب کو ٹلوکا کی اس زبان درازی پر غصّہ آ گیا۔ راجہ رئیس ٹھیرے۔ اُسے سخت سُست کہا اور بولے کوئی ہے۔ ذرا اس بڈّھے کی گوشمالی تو کر دے۔ یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔

اُنھوں نے تو غنڈہ دھمکانے کی نیت سے کہا۔ مگر چپراسیوں کی نگاہوں میں چاندا پار کھٹک رہا تھا۔ ایک تیز دم چپراسی قادر خاں نے لپک کر بڈّھے کسان کی گردن پکڑی اور ایسا دھکا دیا۔ کہ وہ بیچارا تھر تھرا کر زمین پر گر پڑا۔ ٹلوکا کے دو جوان بیٹے چپ چاپ کھڑے تھے۔ باپ کی یہ حالت دیکھی تو خون نے جوش مارا۔ دونوں جھپٹے اور قادر خاں پر ٹوٹ پڑے۔ دھماکے کی آوازیں آنے لگیں۔ صافا گرا۔ اچکن تار تار ہو گئی۔ اور قادر خاں زمین دوز ہو گئے۔ ہاں زبان کی تیزی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

ٹلوکا نے دیکھا کہ بات بگڑ گئی۔ اٹھا اور قادر خاں کو چھڑا کر اپنے لڑکوں کو گالیاں دینے لگا۔ جب لڑکوں نے اُلٹے اسی کو ڈانٹا تو دوڑ کر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ مگر بات سچ مچ بگڑ چکی تھی۔ اُس کی مصلحت آمیزیاں بے اثر ہوئیں۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بولے۔ بے ایمان آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جا۔ ورنہ تیرا خون پی جاؤں گا۔

بُوڑھے کے جسم میں خون تو نہ تھا، مگر کچھ گرمی ضرور تھی۔ سمجھا تھا، کہ یہ کچھ انصاف کرینگے۔ یہ پھٹکار سُن کر بولا۔ "سرکار بُڑھاپے میں آپ کے دروازے پر پانی اُتر گیا۔ اور اُس پر سرکار ہمیں کو ڈانٹتے ہیں۔ کنور صاحب نے کہا۔ "تمہاری عزت ابھی کیا اُتری ہے، اب اُترے گی۔"

دونوں لڑکے طیش میں آکر بولے۔ "سرکار اپنا روپیہ لیں گے کہ کسی کی عزت لیں گے؟"

کنور صاحب نے اینٹھ کر کہا۔ "روپیہ پیچھے لیں گے۔ پہلے دیکھیں گے تمہاری عزت کیسی ہے۔"

(۷)

چاند پارہ کے کسان اپنے گاؤں میں پہنچ کر پنڈت درگا ناتھ سے یہ رام کہانی کہہ ہی رہے تھے۔ کہ اتنے میں کنور صاحب کا آدمی آپہنچا۔ اور خبر دی کہ سرکار نے اسی دم آپکو بلایا ہے۔

درگا ناتھ نے آسامیوں کو تشفی دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر دربار میں حاضر ہوئے۔

کنور صاحب کی آنکھیں غصہ سے لال تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا۔ کئی مختار اور چپراسی بیٹھے ہوئے آگ پر تیل ڈال رہے تھے۔

پنڈت جی کو دیکھتے ہی کنور صاحب بولے۔ "چاند پارہ والوں کی حرکت آپنے دیکھی؟"

پنڈت جی نے سر جھکا کر کہا۔ "جی ہاں نہایت رنج ہوا۔ یہ تو ایسے سرکش

نہ بھتے۔"

کنور صاحب بولے۔" یہ سب آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے۔ آپ ابھی اسکول کے لڑکے ہیں۔ آپ کیا جانیں دنیا میں کس طرح دنیا ہوتا ہے۔ اگر آپ کا اسامیوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا۔ تو پھر میں زمینداری کر چکا۔ یہ سب آپ کی کرنی ہے۔ میں نے ابھی دروازے پر اسامیوں کو رسیوں سے باندھ باندھ کر الٹے لٹکا دیا ہے۔ اور کسی نے چوں تک نہیں کی۔ آج ان کی یہ جرأت کہ میرے سامنے میرے ہی آدمی پر ہاتھ چلائیں۔"

درگاناتھ نے معذرت آمیز انداز سے کہا۔" حضور! اس میں میری کیا خطا ہے۔ میں نے جب سے سنا ہے۔ خود افسوس کر رہا ہوں۔"

کنور صاحب نے فرمایا۔" آپ کی خطا نہیں ہے تو اور کس کی ہے آپ ہی نے انہیں سر چڑھایا۔ بیگار بند کر دی۔ آپ ہی ان کے ساتھ بھائی چارہ رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے آدمی اس برتاؤ کی قدر نہیں کر سکتے۔ کتابی اخلاق مدرسوں کے لئے ہے۔ دنیاوی اخلاق کا قانون دوسرا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب میں چاہتا ہوں۔ کہ ان بدمعاشوں کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں۔ اسامیوں کو ابھی آپنے مال گذاری کی رسید تو نہیں دی ہے؟"

درگاناتھ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔" جی نہیں۔ رسیدیں تیار ہیں۔ صرف آپ کے دستخط کی دیر ہے۔"

کنور صاحب کے چہرہ پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ بولے۔" یہ بہت

اچھا ہوا شگون اچھے ہیں۔ اب آپ ان رسیدوں کو چراغ کے سپرد کر دیجئے ان لوگوں پر بقایا لگان کی نالش کی جائیگی۔ فصل نیلام کرا دوں گا بھوکوں مرینگے تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ جو روپیہ اتبک وصول ہو چکا ہے۔ نہ بیج اور کھاتے میں چڑھا لیجئے۔ آپکو شہادت صرف یہ دینی ہوگی۔ کہ مالگذاری کی مد میں نہیں۔ قرضہ کی مد میں روپیہ وصول ہوا۔ بس۔"

درگا ناتھ سکتے میں آ گئے۔ کیا یہاں بھی انہیں آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جن سے بچنے کیلئے یہ گوشۂ قناعت اختیار کیا تھا۔ جان بوجھ کر اتنے غریبوں کی گردن پر چھری پھیر دوں۔ اس لئے کہ میری نوکری قایم رہے! نہ! یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ بولے۔ "کیا میری شہادت کے بغیر کام نہ چلے گا؟"

کنور صاحب نے غصہ سے کہا۔ "کیا اتنا کہنے میں آپکو کوئی عذر ہے؟"

درگا ناتھ نے دبدھے کے لہجے میں کہا۔ "جی یوں تو میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ ہر ایک حکم کی تعمیل کیلئے حاضر ہوں۔ مگر میں نے شہادت کبھی نہیں دی ہے۔ اور شاید یہ کام مجھ سے انجام نہ ہو سکے۔ مجھے تو معاف ہی رکھا جائے۔"

کنور صاحب نے تحکمانہ انداز سے فرمایا۔ "یہ کام آپکو کرنا پڑے گا۔ اس میں حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں ہے۔ آگ آپ نے لگائی ہے۔ بجھائے گا کون؟"

درگا ناتھ نے زور دے کر کہا۔ "میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں ہوں اور اس طرح کی شہادت نہیں دے سکتا۔"

کنور صاحب مصلحت آمیز لہجے میں بولے۔ جس میں طنز کا پہلو غالب تھا۔ "مہربان یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے جھوٹ کا بیوپار نہیں کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ آپ روپیہ کی وصولی سے انکار کیجئے۔ جب آسامی میرے مقروض ہیں۔ تو مجھے اختیار ہے کہ چاہے روپیہ قرضہ کی مد میں وصول کروں چاہے مالگذاری کی مد میں اگر اتنی سی بات کو آپ جھوٹ سمجھتے ہیں۔ تو یہ آپکی زیادتی ہے۔ ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی۔ ایسی صاف گوئی کیلئے دنیا میں جگہ نہیں ہے۔ آپ میرے ملازم ہیں۔ آخر حق نمک بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ تعلیمیافتہ ہونہار آدمی ہیں۔ ابھی آپکو دنیا میں بہت دن رہنا اور بہت کام کرنا ہے۔ ابھی سے آپ یہ روش اختیار کرینگے تو آپکو زندگی میں بجز مایوسی اور پریشانی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ایمانداری بیشک اچھی چیز ہے۔ مگر اعتدال کا خیال بھی رہنا چاہیئے۔ انتہا ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔ اب زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یہ موقع ایسا ہی ہے۔"

کنور صاحب پرانے پھینکیت تھے۔ نوجوان کھلاڑی ہار گیا۔ وہ پس و پیش کے جال میں پھنس گیا۔ جو نیک ارادوں کیلئے سم قاتل ہے۔

(۵)

اس واقعہ کے تیسرے دن چاندا پاڑ کی آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش ہوئی۔ سمن آئے۔ گھر گھر کہرام مچ گیا۔ سمن کیا تھے۔ موت کے پروانے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی منادن ہونے لگی۔ عورتیں زمیندار کو سے

لگیں۔ اور مرد اپنی تقدیروں کو مقررہ تاریخ کے دن گاؤں کے گنواڑ کندھے پر لٹیا ڈور اور انگوچھے میں چبینہ باندھے کچہری کو چلے۔ سینکڑوں عورتیں اور بچے روتے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے۔ گویا وہ ان سے اب پھر نہ ملیں گے۔

پنڈت درگا ناتھ کیلئے یہ تین دن سخت آزمائش کے دن تھے۔ ایک طرف کنور صاحب کی دلجوئیاں تھیں دوسری طرف کسانوں کی آہ وزاریاں مگر پس وپیش کے بھنور میں تین دن تک غوطے کھانے کے بعد اُنہیں زمین کا سہارا مل گیا۔ دل نے کہا۔ "یہ پہلی آزمائش ہے۔ اگر اس میں ناکام رہے تو پھر ان کا سامنا کرنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ فیصلہ ہو گیا۔ کہ میں اپنے فائدے کیلئے اتنے بچوں کو نقصان نہ پہنچاؤں گا۔

دس بجے دن کا وقت تھا۔ عدالت کے احاطہ میں میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جابجا چھوٹے بڑے سیہ پوش دیوتاؤں کی پوجا ہو رہی تھی۔ چاند اپار کے کسان غول کے غول ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھے۔ اُن سے کچھ دور پر کنور صاحب کے مختار عام اور سپاہیوں اور گواہوں کا ہجوم تھا۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔ جسطرح مچھلی پانی میں پہنچ کر کلیلیں کرتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ کوئی پان کھا رہا تھا۔ کوئی حلوائی کی دوکان سے پوریوں کے تیل لئے چلا آتا تھا۔ اُدھر بیچارے کسان درخت کے نیچے خاموش اُداس بیٹھے ہوئے سوچتے تھے۔ کہ آج نہ جانے کیا ہو گا۔ نہیں معلوم کیا آفت آئے گی؟ رام کا بھروسہ ہے۔

مقدمہ پیش ہوا۔ استغاثہ کی شہادتیں گزرنے لگیں۔ یہ اسامی بڑے سرکش ہیں۔ جب لگان مانگا جاتا ہے۔ تو جنگ پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اب کے انہوں نے ایک حبہ تک نہیں دیا۔ قادر خاں نے رو کر اپنے سر کی چوٹ دکھائی۔ سب کے پیچھے پنڈت درگا ناتھ کی پکار ہوئی۔ انہیں کے بیان پر استغاثہ کا فیصلہ تھا۔ وکیل صاحب نے انہیں خوب طوطے کی طرح پڑھا رکھا تھا۔ مگر انکی نگاہوں سے پہلا ہی جملہ نکلا تھا۔ کہ مجسٹریٹ نے ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ وکیل صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ مختار عام نے انکی طرف گھور کر دیکھا۔ اہلمد اور چپڑاسی سب کے سب ان کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

عدالت نے سخت لہجہ میں کہا کہ "تم جانتے ہو کہ مجسٹریٹ کے روبرو کھڑے ہو!"

درگا ناتھ نے مؤدبانہ مگر مستقل انداز سے جواب دیا۔ "جی ہاں خوب جانتا ہوں"۔

عدالت:۔ "تمہارے اوپر دروغ بیانی کا مقدمہ عائد ہو سکتا ہے"۔

درگا ناتھ:۔ "بے شک اگر میرا بیان غلط ہو"۔

وکیل نے ان سے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کسانوں کے دودھ گھی اور نذرانہ نے یہ کایا پلٹ کر دی ہے۔ اور مجسٹریٹ کی طرف پر معنی انداز سے دیکھا۔

درگا ناتھ بولے۔ "آپ کو ان نعمتوں کا زیادہ تجربہ ہو گا۔ مجھے اپنی روکھی سوکھی روٹیاں زیادہ پیاری ہیں"۔ عدالت نے پوچھا۔ "تم از روئے حلف کہتے ہو۔ کہ ان اسامیوں نے بالکل معاملہ بیباق کر دیا ہے"۔

درگا ناتھ نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میں از روئے حلف کہتا ہوں کہ ان کے ذمہ لگان کی ایک کوڑی باقی نہیں ہے"۔

عدالت:۔ "رسیدیں کیوں نہیں دیں؟"

درگا ناتھ :- "میرے آقا کا حکم"

(۶)

مجسٹریٹ نے نالشیں خارج کر دیں۔ کنور صاحب کو جونہی اس شکست کی خبر ملی، ان کے غیض و غضب کی کوئی حد نہ رہی۔ پنڈت درگا ناتھ کو ہزاروں ہی بے نقطہ سنائیں، نمک حرام۔ دغاباز۔ بیوفا۔ مکار۔ میں نے اس شخص کی کتنی خاطر کی۔ مگر کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ آخر دغا کر ہی گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ پنڈت درگا ناتھ مجسٹریٹ کا فیصلہ سنتے ہی مختار عام کو کنجیاں اور کاغذات سپرد کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ ورنہ اس نمک حرامی کے صلہ میں کچھ دنوں تک ہلدی اور گڑ پینے کی ضرورت ہوتی۔

کنور صاحب کا لین دین وسیع پیمانہ پر تھا۔ چاند اپار بڑا علاقہ تھا۔ وہاں کے اسامیوں سے کئی ہزار کی رقم آنی تھی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب یہ روپیہ ڈوب جائیگا۔ وصول ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس پنڈت نے اسامیوں کو سر چڑھا دیا۔ اب انہیں میرا کیا خوف! اپنے کارندوں اور مشیروں سے صلاح لی۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ اب وصولی کی کوئی صورت نہیں۔ کاغذات عدالت میں پیش کئے جائیں گے۔ تو آمدنی کا ٹیکس تو لگ جائیگا۔ مگر روپیہ وصول ہونا مشکل۔ عذرداریاں ہونگی۔ کہیں حساب میں کوئی غلطی نکل آئی تو رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے گی۔ اور دوسرے علاقوں کا روپیہ بھی مارا جائیگا۔

مگر دوسرے دن جب ٹھاکر صاحب پوجا پاٹھ سے فارغ ہو کر اپنی چوپال میں بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ چاند اپار کے اسامی غول کے غول چلے آ رہے ہیں۔ انہیں خوف ہوا۔ کہ کہیں یہ سب کوئی فساد کرنے تو نہیں آئے؟ مگر کسی کے ہاتھ میں لکڑی تک نہ تھی۔ ملو کا آگے آگے آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے جھک کر سلام کیا۔ ٹھاکر صاحب کو

ایسی حیرت ہوئی۔ گویا کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

مولا نے سامنے آکر عرض کی۔ "سرکار ہم لوگوں سے جو بھول چوک ہوئی۔ اسے ماپھ کیا جائے۔ ہم لوگ سب ہجور کے چاکر ہیں۔ سرکار نے ہمکو پالا ہے۔ اب بھی ہمارے اوپر وہی نگاہ رہے۔"

کنور صاحب کا حوصلہ بڑھا۔ سمجھے کہ پنڈت کے چلے جانیکے بعد ان سبھوں کے ہوش ٹھکانے ہو گئے ہیں۔ اب کس کا سہارا لیں گے۔ اسی بدمعاش نے ان سب کو بھڑکا دیا تھا۔ کڑک کر بولے۔ "وہ تمہارے حمایتی پنڈت کہاں گئے۔ وہ آجاتے تو ذرا اُن کی مزاج پرسی کی جاتی۔"

بوڑھے مولا نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ "سرکار انکو کچھ نہ کہیں وہ آدمی نہیں دیوتا تھے۔ جوانی کی سوگند ہے۔ جو انہوں نے آپکی کوئی شکایت کی ہو۔ وہ بیچارے تو ہم لوگوں کو بار بار سمجھاتے رہتے تھے۔ کہ دیکھو مالک سے بگاڑ کرنا اچھی بات نہیں۔ ہم سے کبھی ایک لوٹے پانی کے روادار نہیں ہوئے۔ چلتے چلتے ہم لوگوں سے کہا۔ کہ مالک کا جو کچھ تمہارے جمے نکلے چکا دینا۔ آپ ہمارے مالک ہیں۔ ہم نے آپکا بہت کھایا پیا۔ آپ ہی کے نمک سے ہمارے تن پلے ہیں۔ اب ہماری سرکار سے یہی بنتی ہے۔ کہ ہمارا حساب کتاب دیکھکر جو کچھ ہمارے اوپر نکلے ہم سے بتا دیا جائے۔ ہم ایک ایک کوڑی چکا کر تب پانی پئیں گے۔"

کنور صاحب کو سکتہ سا ہو گیا۔ انہیں روپوں کیلئے کتنی بار زبردستی کھیت کٹوائے گئے۔ کتنی بار گھروں میں آگ لگوائی گئی۔ کتنی بار مار پیٹ کی۔ کیسی کیسی سختیاں کیں۔ کیسے کیسے ستم ڈھائے اور آج یہ سب خود بخود سارا حساب صاف کرنے آئے ہیں۔ یہ

کیا جادو ہے؟

مختارِ عام صاحب نے کاغذات کھولے اور اسامیوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں کھولیں۔ جس کے ذمہ جتنا نکلتا تھا اس نے بے چون وچرا وہ رقم سامنے رکھدی، دیکھتے دیکھتے سامنے روپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ چھ ہزار روپیہ دم کے دم میں وصول ہو گیا۔ کسی کے ذمہ کچھ باقی نہیں۔ یہ سچائی اور انصاف کی فتح تھی۔ زبردستی اور ظلم سے جو کام کبھی نہ ہوا۔ وہ انسانیت نے پورا کر دکھایا۔

کل جب سے یہ لوگ مقدمہ جیت کر گھر آئے۔ اسی وقت سے انہیں روپیہ ادا کرنے کی دھن سوار تھی۔ پنڈت جی کو وہ سچ مچ دیوتا سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ ان کی سخت تاکید تھی۔ کسی نے غلہ بیچا۔ کسی نے گہنے گرو رکھے۔ کسی نے بیل فروخت کئے۔ یہ سب کچھ سہا مگر پنڈت جی کی بات نہ ٹالی۔

کنور صاحب کے دل میں پنڈت جی کی طرف سے جو بدگمانی اور کدورت تھی۔ وہ بہت کچھ مٹ گئی۔ مگر انہوں نے ہمیشہ سختی اور ظلم سے کام لینا سیکھا تھا۔ انہیں اصولوں کے وہ قائل تھے۔ انصاف اور سچائی اور ملائمت کی انہوں نے کبھی آزمائش نہیں کی اور ان پر ان کا بالکل اعتقاد نہ تھا۔ مگر آج انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ سچائی اور نرمی میں بڑی طاقت ہے۔ یہ آسامی میرے قابو سے نکل گئے تھے۔ میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ یہ خوف کا کرشمہ نہیں، حق اور انصاف کی تاثیر ہے۔ مختصر وہ پنڈت سچا اور دھرماتما آدمی تھا۔ اس میں مصلحت اندیشی نہ ہو، موقع شناسی نہ ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سچا اور بے لوث تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

جب تک ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔ اس کی تیاری لگا ہوں میں قدر نہیں ہوتی۔ ہری دوب بھی کسی وقت اشرفیوں کے تول بک جاتی ہے۔ کنور صاحب کا کام ایک بے لوث آدمی بغیر زرکا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے پنڈت جی کے اس مردانہ فعل کی قدر ایک شاعر کے فکر سخن سے زیادہ نہ ہوئی۔ چاندپارہ کے آدمیوں نے تو اس کے بعد اپنے زمیندار کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی۔ ہاں ریاست کے دوسرے حصوں میں وہی سابق دستور رگڑا جھگڑا مچی رہتی تھی۔ روزانہ عدالت، روزانہ فوجداری، روزانہ ڈانٹ پھٹکار، مگر یہ سب زمینداری کے سنگار ہیں۔ ان کے بغیر زمینداری کیا؟ آخر وہ دن بھر بیٹھے بیٹھے کیا مکھیاں مارتے۔ کنور صاحب اسی طرح شانِ قدیم کے ساتھ اپنا انتظام سنبھالتے جاتے تھے۔

کئی سال گزر گئے کنور صاحب کا کاروبار روز بروز چمکتا گیا۔ اور باوجود اس کے کہ پانچ لڑکیوں کی شادیاں بڑے حوصلے اور دھوم کے ساتھ کیں۔ ان کے عروج میں زوال نہ آیا۔ ہاں قویٰ البتہ کچھ کچھ ڈھیلے ہونے لگے۔ افسوس یہ تھا کہ ابتک اس مال وزر اور جاہ وحشم کا کوئی وارث نہیں تھا۔ بھانجے، بھتیجے اور نواسے ریاست پر دانت لگائے ہوئے تھے۔

کنور صاحب کا دل ان دنیاوی جھگڑوں سے پھرتا جاتا تھا۔ آخر یہ رونا دھونا کس لئے؟ اب ان کی طرزِ زندگی میں ایک انقلاب ہوا۔ کبھی کبھی سادھو سنت ان کے دروازہ پر دھونی رمائے نظر آتے۔ وہ خود اب بھگوت گیتا،

اور دشنو پران زیادہ پڑھتے۔۔ تیرنی گھاٹ سے اُترنے کے سامان ہونے لگے۔
لیکن پرماتما کی مرضی! سادھو سنتوں کی دُعا کی بدولت خواہ دھرم اور پُن کے
اثر سے۔ بڑھاپے میں اُن کے لڑکا پیدا ہوا۔ سوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ زندگی کی
اُمیدیں بر آئیں۔ خوب دِل کھول کر مال و زر لٹایا۔

مگر جس طرح بانس کی جڑ میں لگی ہوئی کونپل جوں جوں بڑھتی ہے۔ بانس
سوکھتا ہے۔ اسی طرح کنور صاحب بھی جسمانی عارضوں میں مبتلا ہوتے گئے۔
ہمیشہ ویدوں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگا رہتا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ کہ دواؤں کا
اُلٹا اثر ہو رہا ہے۔ قابض مُسہل اور مسہل قابض کا کام کرتی۔ جوں توں کر کے
اُنھوں نے دو ڈھائی سال کاٹے۔ یہاں تک کہ طاقتوں نے جواب دے دیا۔ زندگی
کی آس ٹوٹ گئی۔ معلوم ہو گیا کہ میرے دِن قریب ہیں۔

مگر یہ ساری جائیداد اور سارا کاروبار کس پر چھوڑ جاؤں۔ افسوس!
ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ بچے کا بیاہ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی توتلی باتیں سُننے
کی بھی نوبت نہ آئی۔ اس جگر کے ٹکڑے کو کسے سونپوں جو اسے اپنا بیٹا سمجھے۔
جو پودے کو سینچے۔ پالے اور اس کی پونجی اُسے سونپ دے۔ لڑکے کی ماں!
عورت ذات نہ کچھ جانے نہ سُنے۔ اس سے کاروبار سنبھلنا مشکل۔ مختارِ عام اور
گماشتے اور کارندے درجنوں ہیں۔ مگر سب کے سب دغاباز، ایمان فروش،
خود غرض، ایک بھی ایسا آدمی نہیں۔ جس پر میری طبیعت جمے۔ کورٹ آف
وارڈس کے سپرد کر دوں تو وہاں بھی سب آفتیں۔ کوئی اِدھر دبائیگا کوئی اُدھر
کھینچے گا۔ یتیم بچے کا کون پُرسانِ حال ہو گا؟ ہائے! میں نے آدمی کی قدر نہ

کی! مجھے آدمی نہیں ہیرا مل گیا تھا۔ میں نے اُسے ٹھکرا سمجھا۔ کیسا سچا۔ کیسا دلیر۔ اپنے ایمان پر قایم رہنے والا آدمی تھا۔ وہ اگر کہیں مجھے مل جائے۔ تو میرے سب بگڑے کام بن جائیں۔ اس بدنصیب لڑکے کے دن پھر جائیں میں اُس کے پیروں پر سر رکھ دوں گا۔ اُسے مناؤں گا۔ اور اپنے لال کو اس کے قدموں پر ڈال دوں گا۔ میں اپنے جنم کی کمائی اُس کے سپرد کر دوں گا۔ اس کے دل میں درد ہے۔ رحم ہے۔ وہ ایک یتیم پر ترس کھائیگا۔ آہ کاش مجھے اس کے درشن مل جاتے۔ میں اس دیوتا کے پیر دھو دھو کر ماتھے پر چڑھاتا۔ آنسوؤں سے اس کے پیر دھوتا! اس سے دیا کا دان مانگتا۔ وہی اگر ہاتھ لگائے تو یہ ڈوبتی ہوئی ڈونگی پار لگ سکتی ہے۔

(۸)

ٹھاکر صاحب کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ وقت آخر آ پہنچا اُنہیں پنڈت درگا ناتھ کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بچے کی صورت دیکھتے۔ اور کلیجہ سے آہ نکل جاتی۔ بار بار پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے۔ ہائے! اس دیوتا کو کہاں پاؤں۔ جو شخص اس وقت اُن کے درشن کرائے۔ آدھی جائداد اس کے نچھاور کر دوں۔ پیارے پنڈت! میری خطا معاف کرو۔ میں اندھا تھا۔ اب میری بانہہ پکڑو۔ مجھے ڈوبنے سے بچاؤ۔ اس معصوم بچے پر ترس کھاؤ۔

عزیز و اقارب کا جمگھٹ سامنے کھڑا تھا۔ کنور صاحب نے ان کے چہروں کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سچی غمخواری کہیں نظر نہ آئی۔ ہر ایک

چہرہ پر خود غرضی جھلک رہی تھی۔ عالم یاس میں انھوں نے آنکھیں موند لیں۔

اُن کی بیوی زار زار رو رہی تھی۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے روتے ہوئے قریب جا کر کہا، "پتی جی! ہم کو اور اس اناتھ بالک کو کس پر چھوڑے جاتے ہو؟"

کنور صاحب نے آہستہ سے کہا، "پنڈت درگا ناتھ پر۔ وہ جلد آئیں گے۔ اُن سے کہہ دینا کہ میں نے اپنا سب کچھ اس کے بھینٹ کر دیا۔ یہ میری آخری وصیت ہے۔"



(ویر ملاپ پریس جالندھر شہر)